# تصوراتِ قائدِ اعظم

(تحقیقی مضامین)

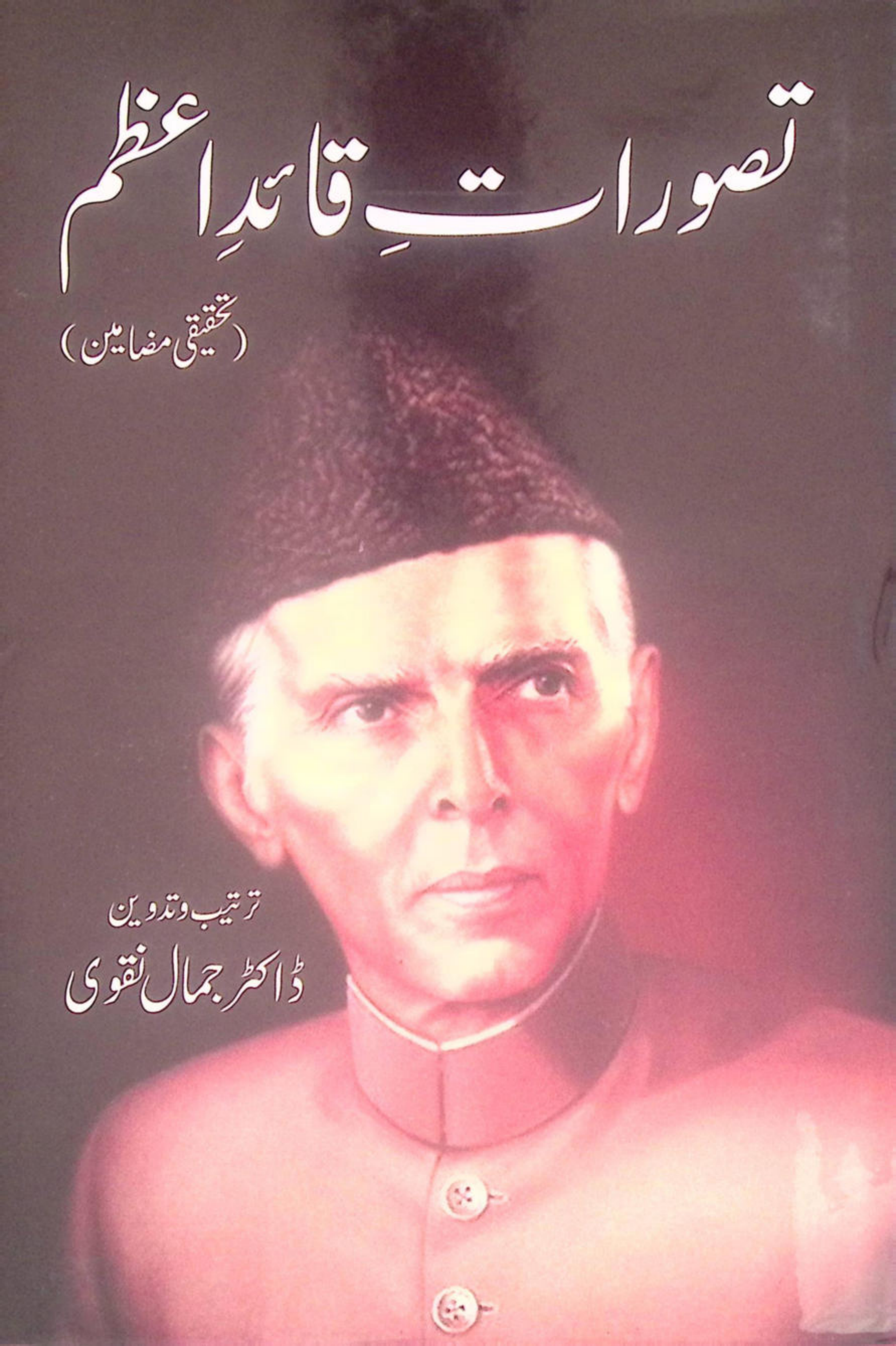

ترتیب و تدوین

**ڈاکٹر جمال نقوی**

# تصوراتِ قائدِاعظم

(تحقیقی مضامین)

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر جمال نقوی

maablib.org

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
**شاعر علی شاعرؔ**
0336-2085325

جملہ حقوق بہ حقِ مرتب محفوظ ہیں

| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | تصوراتِ قائدِ اعظم (تحقیقی مضامین) |
| مرتب | : | ڈاکٹر جمال نقوی 0321-8739362 |
| اشاعت | : | جنوری 2019ء |
| ناشر | : | رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی 0345-2610434 021-32761100 rangeadab@yahoo.com www.facebook.com/rangeadab |
| تزئین کار | : | شیرازی شاعر 0300-2054154 |
| پرنٹر | : | محبوب پریس، کراچی |
| تعداد | : | 300 |
| صفحات | : | 208 |
| قیمت | : | 600/= روپے |

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے:

**رنگِ ادب پبلی کیشنز**

آفس نمبر 5- کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

تحریکِ پاکستان اور افکارِ قائدِاعظم کے مطالعے کا
ذوق و شوق رکھنے والوں کے لیے
صاحبانِ علم و شعور کی روشن تحریروں کا انتخاب
مجاہدینِ پاکستان کے نام

maablib.org

''میں چاہتا ہوں کہ باوجود ان خطرات کے جو ہمیں درپیش ہیں، آپ سب مل کر اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے۔''

قائدِاعظم محمد علی جناح

# ڈاکٹر جمال نقوی کی دیگر کتابیں

۱۔ ہمہ جہت اقبال (تنقید) ۲۰۱۶ء

۲۔ ادب اور سماجی شعور (تنقید) ۲۰۱۵ء

۳۔ نئے دن کی بشارت (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء

۴۔ روشن راہیں (کالموں کا مجموعہ) ۲۰۱۴ء

۵۔ ترقی پسند ادب کے معمار (تذکرہ نگاری/تحقیق) ۲۰۱۳ء

۶۔ ابراہیم جلیس۔ انسان اور قلم کار ۲۰۱۳ء

۷۔ دھنک رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۲۰۱۲ء

۸۔ ارمغان ممتاز (تالیف) ۲۰۱۲ء

۹۔ ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال (تحقیق) ۲۰۱۲ء

۱۰۔ فیض کا فکری ابلاغ (تنقید) ۲۰۱۱ء

۱۱۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (تاریخ) ۲۰۱۱ء

۱۲۔ پنج رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۱۲۱۰ء

۱۳۔ مجنوں گورکھپوری۔ شخصیت وفن (تنقید) ۱۲۱۰ء

۱۴۔ بلاوا (سفرنامہ) ۲۰۰۹ء

۱۵۔ ہجرت (ترجمہ) ۲۰۰۸ء

۱۶۔ زندگی کا سورج (شعری مجموعہ) ہندی۔ ۲۰۰۷ء

۱۷۔ جمال وکمال (یادداشتیں) ۲۰۰۷ء

۱۸۔ ترقی پسند تحریک۔ ادب اور سجاد ظہیر (تنقید) ۲۰۰۶ء

۱۹۔ کہانیاں دیس دیس کی (تراجم) ۲۰۰۶ء

۲۰۔ نقد وشخص (تنقید) ۲۰۰۵ء

۲۱۔ ادب، سائنس اور جمہوریت (تنقید) ۲۰۰۴ء

۲۲۔ مزاج سخن (مجموعہ غزلیات) ۲۰۰۳ء

۲۳۔ قائدین پاکستان (پاکستانیت) ۲۰۰۲ء
۲۴۔ قلم برائے امن (تالیف) ۲۰۰۱ء
۲۵۔ قلم کا سفر (تالیف) ۲۰۰۰ء
۲۶۔ نغمے سورج دیس کے (مجموعہ ہائیکو) ۲۰۰۰ء
۲۷۔ ادب اور سائنس (تالیف) ۱۹۹۹ء
۲۸۔ خوشبو گلابوں کی (عالمی تراجم و طبع زاد نظمیں) ۱۹۹۸ء
۲۹۔ آئی ایم ایف اور پاکستان کی سیاسی معیشت (ترجمہ) ۱۹۹۷ء
۳۰۔ انجینئرنگ ہوریزن (انگریزی مضامین) ۱۹۹۵ء
۳۱۔ مکان شیشے کا (شعری مجموعہ) ۱۹۸۷ء
۳۲۔ گلہائے عقیدت (منقبتی مجموعہ) ۱۹۸۵ء
۳۳۔ ہم کلام (مکالمے) ۲۰۱۷ء
۳۴۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شخصیت و فن (تنقید) ۲۰۱۸ء
۳۵۔ عقیدتیں (حمد، نعت، منقبت) ۲۰۱۸ء
۳۶۔ سرسید کے نورتن (مضامین) ۲۰۱۸ء
۳۷۔ تصوراتِ قائدِ اعظم (تحقیقی مضامین) ۲۰۱۹ء
۳۸۔ معجزۂ فن (فارسی کلام اقبال مع ترجمہ و تشریح) زیرِ طبع
۳۹۔ منتخبات مجنوں (انتخاب) زیرِ طبع
۴۰۔ ہائیکو دبستان...... زیرِ طبع
۴۱۔ سندھ کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات (تالیف) زیرِ طبع
۴۲۔ اکیسویں صدی (سائنسی مضامین) زیرِ طبع
۴۳۔ ترقی پسند نظم (تحقیق) زیرِ طبع
۴۴۔ ہمہ رنگ غالب (تنقید) زیرِ طبع
۴۵۔ جمالیات (مضامین) زیرِ طبع

◆◆◆

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| دیباچہ | ڈاکٹر جمال نقوی | 9 |


## مضامین


| | | |
|---|---|---|
| قایدِ اعظم کا تصورِ پاکستان | قائد کا خطاب | 17 |
| قایدِ اعظم کے سیکولر تصورات | پروفیسر حمزہ علوی | 22 |
| قایدِ اعظم کا تصورِ قومی زبان | ڈاکٹر وزیر آغا | 39 |
| قائد کا تصورِ اسلام اور پاکستان | ڈاکٹر منظور احمد | 44 |
| قایدِ اعظم کا تصور ثقافت | ڈاکٹر فرمان فتح پوری | 63 |
| قایدِ اعظم کے سیاسی تصورات | سید ارتضیٰ حسین | 66 |
| محمد علی جناح کا تصورِ پاکستان | قطب الدین عزیز | 73 |
| قایدِ اعظم کا تصورِ تعلیم | مختار زمن | 77 |
| قایدِ اعظم ...... تصورات اور مشن | پروفیسر شریف المجاہد | 83 |
| قائد کی شخصیت اور تصورات | مترجم: پروفیسر آفاق صدیقی | 87 |
| قایدِ اعظم اور سر سیّد کا تصورِ حب الوطنی | ظلِ احمد نظامی | 99 |

| | | |
|---|---|---|
| قایدِ اعظم کا تصورِ ثقافت | پروفیسر سحر انصاری | 107 |
| قایدِ اعظم کی ترجیحات اور تصورِ تعلیم | ڈاکٹر محمد علی صدیقی | 111 |
| تصوراتِ قایدِ اعظم اور سچد آنند سنہا | پروفیسر علی حیدر ملک | 113 |
| قایدِ اعظم کا تصورِ پاکستان | ڈاکٹر محمد رضا کاظمی | 118 |
| محمد علی جناح کا تصورِ وفاق | مترجم: ڈاکٹر سید جعفر احمد | 124 |
| قائد کا اشتراکی تصور اور رہبری | ڈاکٹر جمال نقوی | 134 |
| سیکولر جمہوریت...... قائد کا تصور | مسلم شمیم | 141 |
| قایدِ اعظم کا تصورِ قیادت | خواجہ رضی حیدر | 158 |
| قائد اعظم کا تصورِ سیاست | مترجم: ابوالفرح ہمایوں | 164 |
| قائد اعظم کا تصورِ مذہب | یوسف راہی چاٹگامی | 197 |
| قایدِ اعظم کا تصورِ ریاست | شاعر علی شاعر | 201 |


◆◆◆

maablib.org

# دیباچہ

## ڈاکٹر جمال نقوی

برصغیر پر انگریزوں کے مکمل اقتدار کے بعد مسلمانوں پر وہ وقت بھی آیا جب وہ ایک طرف اپنے ہم وطن ہندوؤں اور دوسری طرف قابضین اقتدار یعنی انگریزوں کے ظلم و جبر کی وجہ سے دل شکستہ ہو گئے اور حوصلے چھوڑ بیٹھے۔ ایسے میں سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے اپنی قلمی، علمی اور فکری جدوجہد سے ایک تحریک کو جنم دیا جس نے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا۔

سرسید کی اس علی گڑھ تحریک نے قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں پہلے مسلمانوں میں انگریزوں اور ہندوؤں کے برابر کھڑے ہونے کی جرأت پیدا کی پھر ان میں مقابلے کا حوصلہ پیدا کیا اور آخرش مسلسل جدوجہد سے اپنی منزل پاکستان کی شکل میں حاصل کر لی۔

قائداعظم (۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء) نے اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے اپنے معتمدین کی ایک جماعت منظم کی جس میں سرفہرست قائد ملت لیاقت علی خان کا نام آتا ہے۔ قائد ملت ایک مخلص، دیانت دار اور امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والے رہنما تھے۔ جن کو اپنی انھی خصوصیات کی بناء پر قائداعظم کا اعتماد حاصل تھا۔ ان دونوں قائدین کے بارے میں سید ہاشم رضا کہتے ہیں کہ قائد اعظم اور قائد ملت کا رشتہ ویسا ہی تھا جیسا مصطفیٰ کمال کا عصمت انونو کے ساتھ اور ماؤزے تنگ کا چو این لائی کے ساتھ تھا۔ قائد ملت ایک قاتل کے ہاتھوں شہید ہوئے لیکن قائداعظم نے پاکستان اور مسلمانوں کی محبت میں اپنی جان قربان کی:

ملت کو دے دیا وہ لہو جو بدن میں تھا

قائداعظم نہایت اصول پرست، راست گو اور حقیقت پسند تھے وہ اعلیٰ تعلیم سے مشرف ہونے کے ساتھ ہی نہایت قوی فہم وفراست کے مالک تھے ان کی انھیں خوبیوں کی بناء پر مہاتما گاندھی بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ گوکھلے اور سروجنی نائیڈو نے انھیں ہندو مسلم یونٹی کا بہترین سفیر مانا ہے۔ یہی سبب تھا کہ ۱۹۱۶ء میں انھیں کانگریس کا ممبر منتخب کیا گیا۔ برصغیر میں جدوجہد آزادی ہندو اور مسلمانوں نے ساتھ مل کر شروع کی۔ لیکن بعد میں ہندوؤں کی غداری اور انگریزوں کی طرف سے ان کی بے جا طرفداری نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اگر انھیں ایک باعزت قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو انھیں ہندوؤں سے الگ ہوکر اپنے سیاسی مستقبل کی خود فکر کرنی ہوگی۔

اس طرح ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کی حیثیت سے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ شروع میں مسلم لیگ کا رویہ کسی قدر نرم تھا جس سے اسے نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر حالات نے مسلم لیگ کو مجبور کردیا اور مسلسل جبر واستبداد نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ مسلم لیگ ایک عوامی تحریک کا محور بن گئی۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی اور پھر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے لیگ کی تنظیم نو کی ذمہ داری اٹھائی۔ قائداعظم کی خودساختہ جلاوطنی کی زندگی ختم کرانے میں قائدملت لیاقت علی خان، راجہ محمد امیر احمد خان آف محمود آباد اور علامہ اقبال کی کوششوں کا دخل ہے۔ علامہ اقبال نے انھیں تحریر کیا۔ ''ہندوستان میں بحیثیت مسلمان آپ ہی کی ذات ہے جس سے ملت مسلمہ یہ توقع کرنے کا حق رکھتی ہے کہ پورے ہندوستان پر جو سیلاب آرہا ہے اس میں آپ کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔'' پیر علی محمد راشدی نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا کہ اگر مسلم لیگ ۱۹۳۷ء میں نیا جنم نہ پاتی تو پاکستان نہ بنتا اور اگر امیر احمد خان (راجہ محمود آباد) نہیں ہوتے تو مسلم لیگ نیا جنم نہیں پاسکتی تھی۔

مردِ آہن قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کے رویہ میں بھی سختی آگئی اور پاکستان جو پہلے بعض لوگوں کو مجذوب کی بڑ اور چند سرپھرے نوجوانوں کا نعرہ معلوم ہوتا تھا ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کو ایک حقیقت بن گیا۔

۱۱، اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے

انھوں نے کہا تھا:

''ہمیں سیاسی قومیت کو فروغ دینا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ہندو ہندو نہ رہیں گے مسلمان مسلمان نہ رہیں گے۔ مذہب کے لحاظ سے نہیں کیونکہ یہ تو اللہ اور بندے کا رشتہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے کیونکہ پاکستان میں بسنے والے سب ایک ہو جائیں گے۔''

۱۴، اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ اُمید کرتے ہیں کہ جن انگریزوں نے پاکستان کی سول سروس اور دفاعی سروس میں خدمت کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے ان سے نئی حکومت اسی طرح کا برتاؤ کرے گی جیسا کہ شہنشاہ اکبر نے ہندو رعایا سے کیا تھا۔

قائد نے اپنے جواب میں جارج ششم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اکبر نے اپنی ہندو رعایا سے جس خوبی اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳سو برس پہلے جب یہودیوں اور نصرانیوں کو شکست دی تھی تو ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئے تھے اور ان کے مذہب اور رسوم میں کسی طرح سے مزاحمت نہ کی۔ جہاں جہاں مسلمانوں نے حکومتیں قائم کیں وہاں رسول خداؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کیا ہے۔ قائد کا کہنا تھا، ہمیں چاہیے کہ ہم احترام انسانیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دنیا کے تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کریں کیونکہ اسلام پر ہماری اجارہ داری نہیں بلکہ یہ تو تمام دنیا کے لوگوں کے لیے ہے جو امن وسلامتی کے خواہاں ہیں اس حقیقت کے پیشِ نظر رکھیں کہ ہمارے رسولؐ صرف ہمارے ہی رسول نہیں بلکہ وہ رحمت اللعالمین بھی ہیں۔ ساری دنیا کے لیے رحمت اور روشن چراغ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

قائدِ اعظم نے اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا:

''ہم سب پاکستانی ہیں۔ نہ پنجابی، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ بلوچی اور نہ بنگالی ہمیں پاکستانی اور صرف پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔ اب آپ باقاعدہ ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ خود کو ایک قوم، ایک عظیم قوم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے اس صوبائی عصبیت کو فوراً ترک کر دیجیے۔ صوبائی عصبیت بھی سنی، شیعہ وغیرہ فرقہ واری کی طرح ایک بہت بڑی لعنت ہے۔''

۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس منعقدہ دہلی میں قائد نے اپنے صدارتی خطبہ میں وضاحت کی کہ پاکستان کا دستور اور طرزِ حکومت کا مسئلہ عوام کی خواہشات کے مطابق وہاں کے منتخب اور جمہوری نمائندے طے کریں گے۔

اسی طرح مجلسِ قانون ساز کے مسلم نمائندگان کے کنونش منعقدہ اپریل ۱۹۴۶ء بمقام دہلی قائد اعظم نے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ ہماری ساری جدوجہد مذہبی حکومت قائم کرنے کے لیے ہرگز نہیں ہے انھوں نے کہا کہ مذہب ہمیں بہت عزیز ہے لیکن بہت سے دیگر امور بالخصوص معاشرتی ومعاشی مسائل ہمارے لیے شدید اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے قائد کی سیاسی بصیرت کا پتا چلتا ہے اور قائدین کے تصور پاکستان کی آگاہی ہوتی ہے۔

۱۴، اگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام اپنے آخری پیغام میں قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا:

''آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کی تعمیر کریں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کی تعمیر کریں۔''

مطالعۂ پاکستان کے ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے میں نے اپنی اس تالیف میں قائدِ اعظم کے تصورات سے متعلق مختلف الخیال صاحبانِ علم کی آراء ان کے شکریے کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دی ہیں تا کہ محبِ وطن قارئین کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ مضامین خصوصی طور پر لکھائے گئے ہیں اور چند میری تحقیق اور ترجمے کا حاصل ہیں۔

ہر سال اگست کا مہینہ ہمیں اپنے قائد کی یہ بات یاد دلاتا رہتا ہے کہ ہمیں تعمیر و تکمیل پاکستان کی جانب تیزی سے قدم اٹھانا ہے۔ جس سفر کا آغاز ہم نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں آج سے ۶۲ سال پہلے شروع کیا تھا اس کو کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہنچانا اب ہماری ذمہ داری ہے۔

یہ بھی ہماری خوش قسمتی تھی کہ تشکیل پاکستان کے وقت ہمیں شاعرِ مشرق مصلح قوم علامہ محمد اقبال کی سربراہی بھی حاصل تھی، جنھوں نے اپنی شاعری سے اصلاحِ قوم کا کام لیا۔ ان کی چشمِ بینا نے مستقبل دیکھ لیا تھا اور اس کا اظہار انھوں نے یوں کیا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لہٰذا انھوں نے ایک پائیدار آشیانے یعنی تشکیل پاکستان کی جانب قوم کو متوجہ کر دیا تھا۔ قائد اعظم کی رہنما قیادت میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر کے تیس لاکھ مسلمانوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کا نذرانہ دے کر جو خطۂ زمین پاکستان کے نام سے حاصل کیا اس کے پاس قیام کے وقت، نہ ذرائع نقل و حمل تھے، نہ تعلیمی ادارے تھے اور نہ اس کی معیشت مضبوط تھی۔ لیکن اس وقت عوام کے جذبۂ حب الوطنی اور قیادت کی فرض شناسی نے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ جس ملک کے لیے بدخواہوں کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد ٹوٹ جائے گا وہ آج ستر سال گزرنے کے بعد بھی قائم ہے۔ ہم سوئی سے لے کر ایٹم بم بنانے کے قابل ہو چکے ہیں۔ اللہ کی رحمت کے ساتھ ہی ہمارے عوام کی محنت، ہمت اور طاقت کی ساری دنیا قائل ہے اور شاید اسی وجہ سے ہمارے دشمن خوف زدہ ہیں۔

آج ملک کے ہر صوبے میں فیکٹریاں اور کارخانے کام کر رہے ہیں، اسکول، کالج اور جامعات قائم ہو چکی ہیں، انجینئرنگ اور میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم دی جا رہی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے بہتر مواقع نوجوانوں کو حاصل ہیں۔ ہمارے نوجوان بھی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اپنے ملک میں روزگار کے بہتر مواقع فراہم نہ ہونے پر غیر ممالک میں کام کر رہے ہیں اور نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو ملک کامیاب ہے، گو کہ اس کامیابی کی رفتار بہت سست ہے۔

یہ جو مغربی ممالک نے پاکستان کو ایک ناکام ریاست قرار دیا ہے۔ یہ آدھا سچ ہے۔ ناکامی آمروں اور نااہل سیاستدانوں کی رہی ہے۔ آمر سے تو توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی مگر سیاستدانوں نے اقتدار کی لوٹ کھسوٹ کے بعد بعض مرتبہ خود اقتدار آمروں کے حوالے کر دیا یا ایسے حالات پیدا کیے کہ آمروں کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقع مل گیا۔

بہر حال اس سے سب ہی متفق ہیں کہ جمہوریت کا سلسلہ اگر جاری رہتا تو کچھ عرصے میں عوام اور سیاستدان سب ہی اس کے رنگ میں رنگ جاتے اور جمہوریت کا کارواں اپنی منزل کی جانب گامزن ہو جاتا۔ اور بھرپور کامیابیاں قوم کا مقدر رہتیں۔

بقول علامہ اقبال جو حالات اس وقت ساری دنیا میں رونما ہو رہے ہیں اسے ہمارے عوام اور خصوصاً صاحبانِ اقتدار کو بخوبی سمجھنا چاہیے اور انھی کے مطابق ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہیے ورنہ علامہ تو فرما ہی گئے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مزے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان والوں نے علامہ کی اس ہدایت کو سمجھ لیا ہے مگر خصوصی طور پر جن سے علامہ کا خطاب تھا وہی ان کے ہم وطن آج تک شاید اس پیغام کو سمجھ نہیں سکے ورنہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ضرور ہوتے۔

یہ جمہوری دورِ حکومت جو قوم کو حاصل ہوا ہے۔ جس کے لیے بہت سوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا ہے۔ خصوصی طور پر شہیدِ پاکستان، قائدِ ملت لیاقت علی خاں، قائدِ عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو اور شہیدِ جمہوریت محترمہ بے نظیر بھٹو۔ ہمیں پاکستان کے یوم آزادی پر خصوصی طور سے یہ عہد کرنا چاہیے.

وطن کی آبرو کو خاک میں ملنے نہیں دیں گے
کسی دشمن کو کوئی چال بھی چلنے نہیں دیں گے
بہا کر خون اپنا خاک کو گلزار کردیں گے
مگر گلشن میں کانٹوں کو کبھی پھلنے نہیں دیں گے
کسے جرأت بھلا ہوگی کہ دیکھے یوں تری جانب
ہم ان گستاخ نظروں کو کبھی اٹھنے نہیں دیں گے
اے روحِ قائداعظم یہ تجھ سے عہد کرتے ہیں
تعصب کی وجہ سے قوم کو بٹنے نہیں دیں گے
انھیں پر چل کے ملکِ پاک پایا ہے جمال ہم نے
ترے نقشِ قدم قائد کبھی مٹنے نہیں دیں گے

اگر پاکستان کے تمام علاقوں میں صنعتی ترقی ہو جائے، تعلیم کی سہولت عام ہو جائے، روزگار

کے بہتر مواقع سبھی کو حاصل ہوں اور عوام کو تحفظ حاصل ہو تو پاکستان ایک فلاحی مملکت بن سکتا ہے۔ جس کا تصوّر قائداعظم نے کی تھی اور جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ جب ہمارے اقتصادی حالات بہتر ہوں گے، ہمیں عالمی اداروں کے قرضوں سے چھٹکارا ملے گا، ہم ہر بار ان کے در پر جھولی نہیں پھیلائیں گے، ان کے دست نگر نہیں ہوں گے اور ان کے اشاروں پر کام نہیں کریں گے۔ تب ہی ہم صحیح معنوں میں آزاد ہوں گے اور آزادی کے محافظ بھی ہوں گے۔

ایک پائیدار اور مستحکم سیاسی نظام اور حکومت ہی ہمارے مسائل کا حل ہے۔ لیکن یہ کام ہمیں اتحاد، یکجہتی اور خلوص نیت کے ساتھ خود ہی کرنا ہے کیونکہ نہ آسمانوں سے فرشتے آئیں گے اور نہ ہی اللہ اس قوم کی حالت بدلتا ہے جو خود اس کام کے لیے اٹھ کھڑی نہ ہو۔ یہی بات مولانا ظفر علی خان بھی کہہ چکے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آخر میں رنگِ ادب پبلی کیشنز کے مالک شاعر علی شاعرؔ کا شکریہ جن کی خواہش پر یہ کتاب ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزری۔

ڈاکٹر جمال نقوی

کراچی

۲۵ر دسمبر ۲۰۱۸ء

•••

maablib.org

# مضامین

# قائدِاعظم کا تصورِ پاکستان

''بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کیسا پاکستان چاہتے تھے۔'' ہر مکتبِ فکر اپنے اپنے خیال کے مطابق تاویل پیش کر رہا ہے۔ قائداعظم نے 11/اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی سے اپنے خطاب میں تمام بنیادی اصول اور نکات وضاحت سے بیان کر دیے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کا آئین اس خطاب کی روشنی میں مرتب کیا جاتا۔ قراردادِ مقاصد کو آئین میں شامل کر کے بنیادی اصولوں کی نفی کی گئی۔ اس تقریر کو بھی پاکستان کے آئین کا حصہ بننا چاہیے۔''

## مجلسِ دستور ساز پاکستان کے اجلاس منعقدہ کراچی میں خطبہ صدارت
## 11 اگست 1947ء

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

آپ نے مجھے اپنا پہلا صدر منتخب کر کے جس اعزاز سے نوازا ہے اس کے لیے میں تہہ دل سے اور پورے خلوص کے ساتھ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ وہ عظیم اعزاز ہے جس سے یہ خود مختار مجلس کسی کو نواز سکتی ہے۔ میں ان رہنماؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تقریروں میں میری خدمات کو سراہا اور میرے بارے میں ذاتی حوالے دیے۔ مجھے اُمید واثق ہے کہ آپ کی حمایت اور آپ کے تعاون سے ہم اس مجلس کو دنیا کے لیے مثال بنا دیں گے۔ مجلسِ دستور ساز کو دو بڑے فریضے سرانجام دینے ہیں۔ پہلا فریضہ تو بہت کٹھن اور ذمہ داری کا ہے یعنی پاکستان کے لیے

دستور مرتب کرنا اور دوسرا ایک کامل خود مختار اور پاکستان کے وفاقی قانون ساز ادارے کا کردار ادا کرنا۔ ہمیں اپنی بہتر مساعی اس امر کے لیے صرف کرنا ہوں گی کہ ہم وفاقی مجلس قانون ساز پاکستان کے لیے ایک عبوری آئین تیار کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ جس بے مثل طوفانی انقلاب کے ذریعے اس برصغیر میں دو آزاد اور خود مختار مملکتیں معرضِ وجود میں آئیں اس پر نہ صرف یہ کہ ہم حیرت زدہ ہیں بلکہ ساری دنیا متحیر ہے۔ فی الواقع یہ صورتِ حال بے مثال ہے اور تاریخِ عالم میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ عظیم برصغیر کہ جس میں ہر قسم کے لوگ آباد ہیں اور ایک ایسے منصوبے کے تحت لایا گیا ہے کہ جو انتہائی نایاب و بے مثال ہے اور اس ضمن میں جو بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ پُرامن طریقے اور عظیم تر تاریخی ارتقا سے حاصل کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں اقلیتوں کا وجود ناگزیر تھا۔

اس مجلس کے پہلے فریضے کے بارے میں، میں اس وقت کسی اچھی طرح غور کی گئی بات کا تو اعلان نہیں کرسکتا لیکن چند چیزیں جو میرے ذہن میں ہیں آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ پہلی اور سب سے زیادہ اہم بات جو میں زور دے کر کہوں گا وہ یہ ہے، یاد رکھیے کہ آپ خود مختار قانون ساز ادارہ ہیں اور آپ کو جملہ اختیارات حاصل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے یعنی آپ فیصلے کس طرح کرتے ہیں پہلی بات جو میں کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے اور بلاشبہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایک حکومت کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان برقرار رکھے تاکہ مملکت اپنے عوام کی جان و مال اور ان کے مذہبی عقائد کو مکمل طور پر تحفظ دے سکے۔

دوسری بات جو اس وقت میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان جس بڑی لعنت میں مبتلا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کے دوسرے ممالک اس سے پاک ہیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ ہماری حالت بہت ہی خراب ہے، وہ رشوت ستانی اور بدعنوانی ہے۔ دراصل یہ ایک زہر ہے۔ ہمیں نہایت سختی سے اس کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں مناسب اقدامات کریں گے جتنی جلد اس اسمبلی کے لیے ایسا کرنا ممکن ہو۔

چور بازاری دوسری لعنت ہے۔ مجھے علم ہے کہ چور بازاری کرنے والے اکثر پکڑے جاتے ہیں اور سزا بھی پاتے ہیں۔ عدالتیں ان کے لیے قید کی سزائیں تجویز کرتی ہیں یا بعض اوقات ان

پر صرف جرمانے ہی کیے جاتے ہیں۔ اب آپ کو اس لعنت کا بھی خاتمہ کرنا ہوگا۔ موجودہ تکلیف دہ حالات میں جب ہمیں مسلسل خوراک کی قلت یا دیگر ضروری اشیائے صرف کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چور بازاری معاشرے کے خلاف ایک بہت بڑا جرم ہے۔ جب کوئی شہری چوری بازاری کرتا ہے تو میرے خیال میں وہ بڑے سے بڑے جرم سے بھی زیادہ گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ چور بازاری کرنے والے لوگ باخبر، ذہین اور عام طور سے ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں اور جب یہ چور بازاری کرتے ہیں تو میرے خیال میں انہیں بہت کڑی سزا ملنی چاہیے کیونکہ یہ لوگ خوراک اور دیگر ضروری اشیائے صرف کی باقاعدہ تقسیم کے نظام کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اس طرح فاقہ کشی، احتیاج اور موت تک کا باعث بن جاتے ہیں۔

ایک اور بات جو فوری طور پر سامنے آتی ہے وہ ہے اقربا پروری اور احباب نوازی، یہ بھی ہمیں ورثے میں ملی، اور بہت سی اچھی چیزوں کے ساتھ یہ لعنت بھی ہمارے حصے میں آئی۔ اس برائی کو بھی سختی سے کچل دینا ہوگا۔ یہ واضح کردوں کہ میں نہ احباب پروری اور اقربا نوازی کو برداشت کروں گا اور نہ ہی کسی اثر رسوخ کو جو مجھ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ڈالنے کی کوشش کی جائے گی قبول کروں گا۔ جہاں کہیں مجھے معلوم ہوا کہ یہ طریقہ کار رائج ہے خواہ یہ اعلیٰ سطح پر ہو یا ادنیٰ سطح پر یقینی طور پر میں اس کو گوارا نہیں کروں گا۔

مجھے علم ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں ہند کی تقسیم، پنجاب اور بنگال کے بٹوارے سے اتفاق نہیں۔ تقسیم کے خلاف بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اب جبکہ اسے تسلیم کیا جا چکا ہے ہم سب کا فرض یہ ہے کہ ہم سب اس کی پابندی کریں۔ عزت مندانہ طریقے سے اس پر عملدرآمد کریں کیونکہ سمجھوتے کے مطابق اب یہ تقسیم قطعی ہے اور اس کا سب پر اطلاق ہوگا۔ لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو زبردست انقلاب رونما ہوا ہے اس کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔ جہاں کہیں بھی ایک قوم اکثریت میں ہے اور دوسری اقلیت میں تو ان دونوں کے مابین پائے جانے والے جذبات اور محسوسات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا اس کے علاوہ کوئی اور اقدام ممکن اور قابلِ عمل تھا؟ تقسیم عمل میں آچکی ہے۔ سرحد کے دونوں جانب ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو اس سے اتفاق نہ کریں اور اسے پسند نہ کریں لیکن میری رائے میں اس مسئلے کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا اور مجھے یقین

ہے کہ تاریخ اس کے حق میں فیصلہ صادر کرے گی۔ مزید برآں جوں جوں وقت گزرتا جائے گا تجربے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہند کے دستوری مسئلے کا صرف یہی واحد حل تھا۔ متحدہ ہند کا تخیل قابلِ عمل نہیں تھا اور میری رائے میں یہ ہمیں خوفناک تباہی کے دہانے پر لے جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رائے درست ہو اور یہ بھی کہ درست نہ ہو لیکن اس کا فیصلہ بھی وقت ہی کرے گا۔ بایں ہمہ اس تقسیم میں کسی ایک مملکت میں یا دوسری مملکت میں اقلیتوں کا وجود ناگزیر تھا۔ اس سے مفر نہیں تھا۔ اس کا بھی کوئی اور حل نہیں تھا۔ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ اگر ہم مملکت پاکستان کو خوش و خرم اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ لوگوں خصوصاً عامۃ الناس اور غریب لوگوں کی فلاح و بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ اگر آپ ماضی کو اور باہمی تنازعات کو نظرانداز کرتے ہوئے باہمی تعاون کے ساتھ کام کریں گے تو کامیابی یقیناً آپ کے قدم چومے گی۔ اگر آپ اپنا رویہ تبدیل کر لیں اور مل جل کر اس جذبے سے کام کریں کہ آپ میں سے ہر شخص خواہ وہ اس ملک کا پہلا شہری ہے یا دوسرا یا آخری سب کے حقوق و مراعات اور فرائض مساوی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کس کا کس فرقے سے تعلق ہے اور ماضی میں اس کے آپ کے ساتھ کس نوعیت کے تعلقات تھے اور اس کا رنگ و نسل یا عقیدہ کیا ہے تو آپ جس قدر ترقی کریں گے اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

میں اس بات پر بہت زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ ہمیں اس جذبے کے ساتھ کام شروع کر دینا چاہیے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ اکثریت اور اقلیت، ہندو فرقہ اور مسلمان قومیت کے یہ چند در چند زاویے معدوم ہو جائیں گے۔ کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی تو پٹھان، پنجابی، شیعہ اور سنی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں اس طرح ہندوؤں میں بھی برہمن، ویش، کھتری ہیں اور بنگالی اور مدراسی ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہی چیزیں ہندوستان کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں، اگر یہ سب کچھ نہ ہوتیں تو ہم کب کے آزاد ہو گئے ہوتے۔ کوئی طاقت دوسری قوم کو اپنا غلام نہیں بنا سکتی بالخصوص اس قوم کو جو چالیس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہو، اگر یہ کمزوری نہ ہوتی تو کوئی اس کو زیر نہیں کر سکتا تھا اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کوئی آپ پر طویل عرصے تک حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اب آپ آزاد ہیں۔ اس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں، اپنے مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبارِ مملکت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جیسا کہ آپ کو تاریخ کے حوالے سے یہ علم ہوگا کہ انگلستان میں کچھ عرصہ قبل حالات اس سے بھی زیادہ ابتر تھے جیسے کہ آج ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نے ایک دوسرے پر ظلم ڈھائے۔ آج بھی ایسے ممالک موجود ہیں جہاں ایک مخصوص فرقے سے امتیاز برتا جاتا ہے اوران پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایسے حالات میں سفر کا آغاز نہیں کیا ہے۔ ہم اس زمانے میں یہ ابتدا کر رہے ہیں جب اس طرح کی تفریق روا نہیں رکھی جاتی۔ دو فرقوں کے مابین کوئی امتیاز نہیں۔ مختلف ذاتوں اور عقائد میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں۔ انگلستان کے باشندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے حقائق کا احساس کرنا پڑا اوران ذمہ داریوں اوراس بارِ گراں سے سبکدوش ہونا پڑا جو ان کی حکومت نے ان پر ڈال دیا تھا اور وہ آگ کے اس مرحلے سے بتدریج گزر گئے۔ آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہاں رومن کیتھولک ہیں نہ پروٹسٹنٹ اب جو چیز موجود ہے وہ یہ کہ ہر فرد ایک شہری ہے اور سب برطانیہ عظمیٰ کے یکساں شہری ہیں۔ سب کے سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا نہ مسلمان، مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔

پس حضرات! میں آپ کا مزید وقت لینا نہیں چاہتا اور ایک بار پھر اس اعزاز کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس سے آپ نے مجھے نوازا۔ میں ہمیشہ عدل اور انصاف کو مشعلِ راہ بناؤں گا اور جیسا کہ سیاسی زبان میں کہا جاتا ہے تعصب یا بدنیتی دوسرے لفظوں میں جانب داری اور اقربا پروری کو راہ نہ پانے دوں گا۔ عدل اور مکمل غیر جانب داری میرے رہنما اصول ہوں گے اور میں یقیناً آپ کی حمایت اور تعاون سے دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں پاکستان کو دیکھنے کی اُمید کرسکتا ہوں۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کے سیکولر تصورات

پروفیسر حمزہ علوی

آپ میں سے بہت سوں کو جناح صاحب کی معروف تقریر کو دوبارہ غور کرنے کے لیے کہوں گا جو کہ انہوں نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ اس تاریخی تقریر میں انہوں نے سیکولر نقطہ کو نئی مملکت کا مقصد قرار دیا تھا جس نے دہائیوں پر محیط جدوجہد کے دوران انہیں اور دیگر اکابرین کو متاثر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

''آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو، ریاست کے معاملات کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم اپنے سفر کا آغاز اس بنیادی اصول سے کر رہے ہیں کہ ریاست کی نظر میں تمام شہری برابر کے شہری ہیں۔ ہمیں اس بات کو نظریہ کے طور پر اپنے سامنے رکھنا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں محسوس ہوگا کہ ریاست کے سامنے سیاسی اصلاح میں ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان۔ یہ بات مذہبی نقطہ نظر نہیں کیونکہ یہ ہر ایک کا ذاتی عقیدہ ہے۔''

1952ء کے بعد جناح صاحب کے غیر ذمہ دار جانشینوں نے ان اصولوں سے روگردانی شروع کر دی اور نیم مردہ مذہبی نعرہ بازی کو اپنی گرتی ہوئی سیاسی ساکھ کو بچانے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا آغاز کیا اور نعرہ لگایا کہ ''اسلام خطرے میں ہے۔'' اس خالی، غیر سنجیدہ اور بوگس نعرے کی وجہ یہ تھی کہ ان نام نہاد سیاسی رہنماؤں کے پاس عوام کو دینے کے لیے کوئی بھی مثبت شے نہ تھی، اس وقت کی ہماری شکست خوردہ قیادت اپنی ناعاقبت اندیشی میں یہ سمجھ بیٹھی کہ اسلام کے نعرے سے مخالفین کو خاموش کر کے سیاسی مفادات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شروع میں انہوں نے صرف زبانی، کلامی اسلام کے نام کو استعمال کیا۔

مارچ 1949ء میں قانون ساز اسمبلی نے ''قرارداد مقاصد'' پاس کی جس کے مطابق ''مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی بنائیں گے۔'' لیکن اس کا مقصد قطعی طور پر یہ نہ تھا کہ ''اسلامی نظریہ'' کو اصول کے طور پر اپنانے کا عندیہ دیا جا رہا ہے۔ جس کا واضح اظہار لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے وقت تقریر کے دوران ہی کیا۔ یہ صرف مذہبی نعرہ بازی کی سمت ایک اشارہ تھا نہ کہ آئین میں تبدیلی کی طرف راستہ۔ لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے وقت نہایت ہی واضح الفاظ میں ملائیت کو رد کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عوام ہی طاقت کا واحد سرچشمہ ہیں اور یہ منطقی طور پر پاپائیت کے قائم ہونے کے خطرے کو ختم کرتا ہے۔''

1950ء میں بنیادی اصولوں کے لیے قائم کمیٹی "Basic Principle Commettee" (BPC) کی عبوری رپورٹ میں لیاقت علی خان نے اسلامی نظریات کی آئین میں موجودگی کے بارے میں نہایت ہی مختصر انداز میں ذکر کیا۔

اس رپورٹ پر ایک مذہبی رہنما پروفیسر جی ڈبلیو چوہدری نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ نئے آئین میں کوئی بھی شق ایسی نہیں جو اسلامی نظریات کی حامل ہو اور تمام علما اس رپورٹ سے خوش نہیں ہیں۔

اس سے پہلے کہ بیسک پرنسپل کمیٹی "Basic Principle Commettee"(BPC) اپنی حتمی آئینی سفارشات پیش کرتی ملک میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ملک کے ستونوں کو ان کی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ جنوری 1952ء کے آخر میں بنگالی زبان کی ایک طاقتور تحریک سارے مشرقی بنگال میں پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے کئی دن سارا مشرقی بنگال حقیقتاً لینگوئج موومنٹ کمیٹی (LMC) کے ہاتھوں میں رہا۔ بنگالی زبان کی تحریک کے رہنما اس کی زبردست کامیابی اور طاقت پر حیرت زدہ تھے۔ اس لیے وہ اس کو مزید آگے بڑھانے کے بارے میں لائحہ عمل تیار کرنے سے قاصر رہے جس کے نتیجے میں یہ زبردست تحریک چندروز میں دم توڑ گئی لیکن یہ آنے والے دنوں میں ایک چیلنج کے طور پر موجود رہی۔

ملک کے حکمران حلقوں نے بنگالی قوم کے مطالبات پر غور کرنے اور ان کے حل کی سمت قدم بڑھانے کی بجائے نہایت بیوقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنگالی قوم پرستوں کو اپنی دانست میں

عوام میں غیر مقبول کرنے کے لیے مذہبی نعرہ بازی کا سہارا لیا۔ ''اسلامی نظریہ'' اور ''اسلامی شناخت'' جیسے نعروں کو بنگالی قوم کے غصہ کے خلاف استعمال کیا گیا۔ بنگالیوں کی بے چینیوں کے اسباب تلاش کرنے کی بجائے حکمرانوں نے یہ بات کرنی شروع کی کہ ہم سب مسلمان اور پاکستانی ہیں لہٰذا ہم میں سے کوئی بھی بنگالی، سندھی، بلوچی یا پٹھان نہیں ہے۔

حالانکہ یہ سب نسلی اور علاقائی پہچانیں تھیں جس کا مذہبی اقدار سے کوئی بھی ٹکراؤ نہیں تھا۔ سب مسلمان اور پاکستانی ہیں یہ ایک ایسا شکست خوردہ اور ذہنی دیوالیہ پن پر مبنی سیاسی نکتہ نظر تھا جس کا منطقی نتیجہ تباہی تھا۔

بنگالی تحریک کے جواب میں 22 دسمبر کو جب بی پی سی (BPC) نے حتمی آئینی سفارشات پیش کیں تو اب اس میں اسلامی نظریات کو بہتر و نمایاں طور پر پیش کیا گیا جس پر پروفیسر جی ڈبلیو چوہدری نے خوشی سے جھومتے ہوئے لکھا کہ بی پی سی (BPC) کے آئین کے لیے پیش کیے گئے دوسرے ڈرافٹ کو اسلامی کردار کی حامل بہت سی شقوں کی موجودگی کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔

لیاقت علی خان اور ان کے حواریوں نے علاقائی تحریکوں کے مقابلے اور دراڑوں کا شکار ہوتی ہوئی پارٹی کو بچانے کے لیے زیادہ زور سے ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔

آزادی کے تقریباً 5 برس گزرنے کے بعد ملک کے دوسرے درجے کے حکمرانوں نے جن کے پاس عوام کو دینے کے لیے کچھ نہ تھا اسلامی نظریہ کو اپنا لیا۔ اب اس طریقہ کار کو زیادہ موثر بنانے کے لیے انہوں نے نئے پیدا کردہ مذہبی نظریہ کو ادارے کی شکل دینے کا فیصلہ کیا اور ''تعلیمات اسلامی'' کے نام سے بورڈ قائم کیا اور بہت سے علما کو اس میں نوکری دی گئی لیکن اس بورڈ کے پاس کوئی حقیقی طاقت نہ تھی کیونکہ پاکستان کی افسر شاہی مولویوں کے ساتھ طاقت بانٹنے کے موڈ میں نہ تھی۔ یوں اس بورڈ کا کردار صرف سفارش کرنے والے کا سا تھا اور وہ بھی ان امور پر جن کے بارے میں اس سے رائے طلب کی جائے۔ بورڈ کی سفارش پر عملدرآمد کرنا یا نہ کرنا حکومت کی مرضی پر تھا۔ اکثر جو سفارشات بورڈ پیش کرتا اسے رد کر دیا جاتا لیکن اس کے باوجود اس میں نوکری کرنے والے بڑے مذہبی علما محض بھاری تنخواہ اور شخصی عزت افزائی کی بنا پر خاصے خوش تھے جبکہ کچھ غیر مطمئن مولوی جن میں مولانا مودودی شامل تھے نے خود کو جیل میں پایا۔

مختلف حکومتوں کی طرف سے اس طرح کی سطحی رعایتیں ''اسلامی نظریہ'' کے حوالے سے

جاری رہیں۔ یہاں تک کے بھٹو صاحب جن کی بعض غلط پالیسیوں نے ملاؤں کو مزید طاقت ور کردیا اور وہ ان کی شکست کا ہتھیار بن کرابھرے جبکہ جنرل ضیاالحق جو کہ حکومت کرنے کے قانونی جواز سے محروم تھے نے اسلام کے نام کو بھرپور طریقہ سے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کئی دہائیاں گزرنے کے باوجود ہم آج بھی اس آمر کی چھوڑی ہوئی میراث کو بھگت رہے ہیں اور کئی ایک جمہوری طور پر منتخب حکومتیں بھی اس سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہیں۔ آج بھی ہم اس مفاد پرست کے ناقابل تردید فعل کی فصل کاٹ رہے ہیں۔

محمد علی جناح کے پاکستان کے نظریہ پر واضح بیان کو گھانس پھونس کی طرح ایک طرف کر کے ان کے جانشینوں نے ان کے جانے کے کافی عرصہ بعد نئے سرے سے نظریہ استوار کیا۔ انہوں نے دعویٰ شروع کردیا کہ ''اسلامی نظریہ'' ہی پاکستان کی نظریاتی اساس ہوگی۔ یہ ایک ایسا حل تھا جو ماضی کی جانب لے جاتا تھا اور ہمارے یہاں کے بعض تاریخ دانوں نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا کہ وہ اس بوگس اور نام نہاد دعویٰ کو درست ثابت کریں گے۔ یوں درسی کتب نئے سرے سے لکھنے کا آغاز ہوا۔

آج نصف صدی سے بولے جانے والے جھوٹ نے ہمیں ہمارے ماضی کی لکھی تاریخ سے کاٹ دیا ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ سیکولر نقطہ نظر کے حامل افراد نے بھی تجسس سے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ وہ مذہب نہیں تھا تو اور کیا تھا جس کی بنیاد پر حقیقتاً یہ ملک بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کیا توجیح ہوسکتی ہے؟

ابھی تک کسی نے ان سماجی قوتوں کا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جو پاکستان بنانے کا حقیقی محرک بنیں۔ اس طرح ہمارا حقیقی ماضی ہم سے چھین کر ایسی جگہ دفن کردیا گیا جہاں سے اسے تلاش نہ کیا جاسکے لیکن ہمیں اسے کھود کر نکالنا ہے۔ چلیں اس ماضی پر ایک مختصر سی نظر ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی جدید سیاست کا آغاز شمالی ہندوستانی صوبوں خصوصاً یوپی اور بنگال سے ہوا جہاں مسلمان آبادی کے لحاظ سے اقلیت میں تھے جبکہ مغربی ہندوستان کے ان علاقوں جو کہ اب پاکستان میں ہے جن میں پنجاب، سندھ اور سرحد شامل ہیں مسلمان نسبتاً پسماندہ تھے اور وہاں شہری آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جدید سیاست کی پشت پر موجود پڑھی لکھی پرت ان علاقوں میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

مسلمانوں کی جدید سیاست کا آغاز 19 ویں صدی کے آغاز پر اس وقت ہوا جب برطانوی

حکمرانوں نے انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت سے خاتمہ عمل میں آیا اور اس صورت حال سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے۔ اب سرکاری نوکری کے لیے انگریزی تعلیم کا حصول لازم ہو گیا۔ یوں نتیجے کے طور پر نوکری پیشہ ہندو ذاتوں جن میں شمالی ہندوستان کے برہمن اور کائستھ (Kayastha)، کھتری (Khatri) اور کشمیری پنڈت یا بنگال کے بیدیا (Baidya) برہمن اور کائستھ ذاتیں تیزی سے انگریزی تعلیم کی جانب راغب ہوئیں اور زیادہ کامیابی سے ان نوکریوں کے لیے مقابلہ شروع کیا جن پر اس سے پہلے صرف مسلمان اشرافیہ کی اجارہ داری تھی۔ یوں مسلمانوں کی برتری کے خاتمے کا آغاز ہوا۔

نوآبادیاتی نظام کے اثرات کے حوالے سے مسلم اشرافیہ کو تین بنیادی درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو مختلف طریقوں سے اس صورت حال کی بنا پر متاثر ہوئے۔ پہلا طبقہ تو مسلم جاگیرداروں کا تھا جو کہ سیاسی طور پر برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں کا حمایت و اتحادی تھا اور اس بنا پر اس طبقے کو خوب فائدہ پہنچایا گیا۔ یہ جاگیردار ایک طبقہ کے طور پر برطانوی راج کے ہمدرد تھے لیکن ان میں سے بعض انفرادی طور پر مخالفین بھی تھے جیسا کہ راجہ صاحب محمود آباد جو برطانوی راج کی سرکاری زبان کی پالیسی کی بنا پر بری طرح متاثر ہوئے۔ ان کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ ان کے مدرسوں میں جو بچے فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے داخلہ لیتے تھے اب انہوں نے نئی صورت حال میں انگریزی سکھانے والے اسکولوں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ پھر دوسرا یہ ہوا کہ نئے عدالتی نظام کے قوانین کے انگلش میں اجرا کی وجہ سے علما کا قانونی معاملات میں رہبرانہ کردار ختم ہو گیا جو کہ وہ شریعہ کے قوانین کے حوالے سے اور مختلف متنازعہ سماجی معاملات میں فتوؤں کے ذریعے ادا کرتے تھے۔

اس صورت حال کے ردعمل میں علما نے پہلے انگریزوں اور پھر سکھوں کے خلاف پرتشدد معرکوں میں خود کو مصروف کیا اور 1857ء کی قومی بغاوت میں اہم کردار ادا کیا مگر انہیں اور بغاوت کو بری طرح کچل دیا گیا۔ اس بغاوت کی ناکامی کے نتیجے میں علما اپنے خانقاہوں، مدرسوں میں پناہ گزین ہو گئے جس میں نئے قائم ہونے والے دارالعلوم دیوبند اور قدیم فرنگی محل شامل تھے۔ یوں ایک گروہ کے طور پر علما نے 1918ء میں اٹھنے والی خلافت تحریک سے پہلے تک کے سالوں میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔

تیسرا اور مسلم اشرافیہ کا سب سے اہم گروہ تعلیم یافتہ افراد کا تھا جو کہ ہندوستان میں جدید مسلم

سیاست کا محور بنا۔ بنیادی طور پر یہ گروہ گورنمنٹ کی نوکریوں پر انحصار کرتا تھا۔ میں نے اس گروہ کو ''تنخواہ دار'' کا نام دیا ہے۔ ایسا گروہ جو تنخواہ کے لیے سرکاری نوکری کرتا ہو۔ اس ''تنخواہ دار'' گروہ میں دیگر پروفیشنل یعنی وکیل اور ڈاکٹر بھی تھے۔ ان تمام کے لیے بھی رائج ہونے والی نئی زبان یعنی انگریزی تعلیم کا حصول ضروری ہوگیا تھا۔ حکومت کی نوکریوں کے حصول کی جدوجہد میں مسلمان تنخواہ داراور پروفیشنل کا مقابلہ ہندو تنخواہ داراور پروفیشنل گروہ سے تھا۔

یہ بدقسمتی کی بات تھی کہ ہندوستانی سماج کے ذات پات، مذہبی تفاوت پر مبنی ساخت کی بناپر ہندواور مسلم تنخواہ داراور پروفیشنل گروہ ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہوگئے کیونکہ ان دونوں کی زندگیوں اور کیریئر کو دو مخالف مگر منظم کمیونٹی نظام نے گھیر رکھا تھا۔ ہندواور مسلم ''تنخواہ دار'' گروہ کی سرکاری نوکریوں کے حصول پر باہمی چپقلش سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی طرح مسلم اشرافیہ جو کہ اپنے مستقبل کے سوال پر مصروف عمل تھی نے غریب مسلمانوں اوران کے مسائل پر کوئی توجہ نہ دی۔ مثلاً 19 ویں صدی میں مسلم جولاہوں کی ایک بڑی تعداد ملکی اور غیر ملکی ملوں کے تیار کردہ کپڑے کی آمد کی بنا پر بحران کا شکار ہوئی تو مسلم اشرافیہ نے غریب جولاہوں کے مصائب پر نہ ہونے کے برابر توجہ دی کیونکہ تنخواہ داراور پروفیشنل گروہ کے اپنے اپنے مخصوص مفادات تھے جن کا حصول انہیں مقصود تھا۔ ہندواور مسلم پیٹی بورژ واطبقہ (تنخواہ داراور پروفیشنل گروہ) کے درمیان مقابلے ہی نے آنے والے وقت میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں کو شکل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہندوستانی قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی کے نام پر اپنے محدود گروہی مفادات کو قانونی اور سیاسی روپ دیا۔

لیکن یہاں غلط طور پر فرض کرلیا گیا ہے کہ مسلمان اشرافیہ غیر مراعات یافتہ اور پسماندہ تھی۔ یہ خیال بنیادی طور پر ولیم ہنٹر (William Hunter) کی ہندوستانی مسلمانوں پر کتاب سے اخذ کیا گیا ہے جو انہوں نے مشرقی بنگال کے اعداد وشمار کی بنیاد پر تحریر کی تھی، جہاں واقعی مسلمان انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے برعکس شمالی ہندوستانی کی مسلم اشرافیہ بہت زیادہ مراعات یافتہ تھی۔ یوپی صوبہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف 12% تھی جس میں مسلم اشرافیہ کی تعداد نہایت قلیل اقلیت کی سی تھی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی اقلیت میں چھوٹی سی اقلیت تھی۔ تاہم 1857ء میں یہ قلیل مسلم اشرافیہ یوپی کی ریاست کی ماتحت عدالتوں اور انتظامیہ کی 64%

نوکریوں پر قابض تھی جبکہ اس سے اوپر کی نوکریوں پر صرف گورے قابض تھے۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ انتہائی مراعات یافتہ مسلم اشرافیہ طبقہ تیزی سے نوکریوں میں اپنا بڑا حصہ کھونے لگا۔ 1886ء کے اعدادوشمار کے مطابق 12% مسلم آبادی کا نوکریوں میں حصہ گھٹ کر 45% رہ گیا جواب بھی ان کی آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا لیکن یہ صورت حال ظاہر کررہی تھی کہ مسلمانوں کا حصہ نصف سے بھی کم ہوکررہ گیا ہے۔ سرسید احمد نے اس لیے تجویز دی تھی کہ نوکریوں میں ہندو مسلم کوٹہ 50۔50 ہونا چاہیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جدید سیاست دراصل کوٹہ سیاست تھی جو آج کل بھی ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ علی گڑھ تحریک انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے پروپیگنڈا کررہی تھی تاکہ مسلمان سرکاری نوکریوں اور پروفیشنل شعبوں میں دوسروں کا مقابلہ کرسکیں۔ انگریزی تعلیم مستقبل میں کامیابی کی کنجی سمجھی گئی اور سرسید کی چلائی جانے والی مہم کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں انگریزی سکھانے کے لیے تعلیمی تنظیمیں وجود میں آنا شروع ہوگئیں۔

یوں انگریزی اور مقامی زبان پر مشتمل ایک نئی ثقافت جنم لینے لگی جو نسبتاً زیادہ عقل پسندی اور سائنس کے قریب تھی اور اکثر اوقات اپنا اظہار ہندوستانی محاوروں میں کرتی نظر آرہی تھی اور یہ اصل میں ہندوستانی اشرافیہ، نوکری پیشہ اور پروفیشنل گروہ کی ثقافت تھی جو غریبوں کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی چاہے وہ مسلم ہو یا کہ ہندو اس وقت کے غریب مسلمانوں کی ثقافت پر ملا کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ سرسید احمد مسلمانوں میں سائنسی، رجائیت پسندانہ خیال اور انگریزی تعلیم کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے لیکن ان کا مطمع نظر صرف اور صرف مسلم اشرافیہ طبقہ کا مستقبل تھا، نہ کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا، جن میں غریبوں کی اکثریت تھی یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس پر بہت کم دھیان دیا گیا ہے۔ وہ غریب گھرانوں میں پیدا ہونے والوں کو حقارت سے دیکھتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی طبقاتی نفرت کا اظہار وائسرائے لیجسلیٹو کونسل ( Viceroy Legislative Council) کی ممبر شپ کے لیے قابلیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا اور کہا کہ ''اس کونسل کے ممبر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تعلق اعلیٰ طبقہ سے ہو۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا ہم اعلیٰ ذات کے لوگ یہ برداشت کرسکتے ہیں کہ نچلی ذات یا خاندان کا فرد چاہے اس نے بی اے (BA) یا ایم اے (MA) ہی کیوں نہ کیا ہو، وہ صرف اس بنا پر ہمارے اوپر حاکم بن بیٹھے اور اسے ایسے قوانین بنانے کی طاقت ہو جو ہماری زندگیوں اور ملکیت کو متاثر کرے؟

1906ء میں مسلم اکابرین کے وفد کی لارڈ منٹو(Lord Minto) سے انگریزی تعلیم یافتہ مسلم اشرافیہ کی مراعات کے لیے ملاقات سے پہلے تک مسلم تنخواہ دار طبقہ اور پروفیشنل گروہ کی سیاسی سرگرمیاں عوامی سطح پر نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ یہ وفد لارڈ مارلے(Lord Morley) کی اس تقریر کے بعد بنایا گیا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت ہندوستان کے لیے کچھ آئینی اصلاحات کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔نواب محسن الملک جو کہ ایک وقت میں علی گڑھ ادارے کے سربراہ تھے نے مسلم وفد کی وائسرائے لارڈ منٹو(Lord Minto) سے ملاقات کا اہتمام کروایا۔

وفد نے ملاقات کے دوران وائسرائے کو تعلیم یافتہ مسلم اشرافیہ طبقہ کے مطالبات سے آگاہ کیا۔اس ملاقات کے نتائج پر فرانسس رابنسن (Francis Robinson) نے لکھا کہ ''لارڈ منٹو(Lord Minto) نے ہمدردی کے جذبات کے علاوہ کچھ بھی وعدہ نہیں کیا۔'' ہندوستانی قوم پرست اور کمیونسٹ تاریخ دانوں نے اس ملاقات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت کا حامل بنا کر پیش کیا اور مولانا محمد علی جوہر کے الفاظ کے مطابق یہ وائسرائے کے احکامات کے عین مطابق منصوبہ بند کوشش تھی لیکن اب یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے کہ اس الزام میں کوئی صداقت نہ تھی۔ دیگر کئی تاریخ دانوں کی طرح نامور ہندوستانی تاریخ داں بمل پرساد(Bimal Prasad) نے حال میں اس وقوع کی تفصیلات بتائی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ الزام درست نہ تھا۔ حقیقت میں وائسرائے سے ملاقات کے محرک بذات خود صرف اور صرف نواب محسن الملک تھے۔

وائسرائے سے ملاقات کے بعد 1906ء ہی میں مسلم رہنماؤں نے نواب سلیم اللہ کی دعوت پر ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی لیکن یو پی کی مسلم اشرافیہ جس کی قیادت علی گڑھ کے نواب وقار الملک کر رہے تھے نے مسلم لیگ کے تمام اعلیٰ عہدوں اور ورکنگ کمیٹی میں اکثریت کے ذریعے تنظیم کو ہائی جیک کر لیا اور مسلم لیگ نے مغربی تعلیم یافتہ مسلم پروفیشنل اور تنخواہ دار طبقہ کے سیکولر مطالبات کے لیے آواز بلند کرنا شروع کر دی جبکہ اسلامی نظریات کو تنظیم کا ایجنڈا بنانے کی کوشش نہ ہونے کے برابر تھیں جو تھیں وہ بھی بری طرح ناکام رہیں۔

مذہبی نظریات نے تنظیم کے بنانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا جبکہ ملا مسلم لیگ کے قیام کے دن سے ہی اس کے سخت مخالف رہے۔اسلامی نظریات کو آگے بڑھانے کی پہلی کوشش مولانا شبلی نعمانی نے کی وہ ملائیت کے قائل تھے۔انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ علی گڑھ کے سلیبس کو اسلامی

بنیادوں پر استوار کیا جائے مولانا شبلی نعمانی چاہتے تھے کہ سلیبس انگریزی اور جدید سائنسی علوم کی بجائے اسلامی تعلیمات اور عربی زبان پر مشتمل ہونا چاہیے۔

اس کا جواب پیشہ ور اور تنخواہ دار طبقے کی طرف سے رضا علی جو کہ علی گڑھ کے ایک مرکزی کردار اور سرسید کے جانشین نواب محسن الملک کے نہایت قریبی ساتھی تھے کے خیالات کی شکل میں دیا گیا۔ رضا علی نے دی اسٹیٹس مین (The Statesman) میں چھپنے والے اپنے مضمون کے ذریعے شبلی نعمانی کی تجاویز کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس مضمون کا کچھ حصہ رضا علی کی خودنوشت میں بھی نقل ہوا ہے جس میں انہوں نے تحریر کیا کہ ''بعض اوقات عقل اور جذبات کے درمیان تصادم ہو جاتا ہے لیکن شبلی نعمانی کی پیش کردہ تجاویز میں یہ تصادم و تضاد دیگر تمام ایشوز پر تصادم سے بڑا ہے۔ مسلمانوں کو غرناطہ اور بغداد کی عظمت کے بارے میں اکسانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ضعیف العقیدہ عورت اپنے تعویز کو دل سے لگا کر رکھتی ہے۔ یہ حقیقت میں نہایت مشکل ہے کہ مسلمانوں کے ان جذبات سے ہمدردی نہ کی جائے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کھلے حقائق سے انکار بھی نہایت حماقت ہے۔ عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی شبلی صاحب کی تجویز ہمارے سامنے ہے یہ سطحی مگر متاثر کرنے والی ہے لیکن ہمیں اپنا منہ حقائق سے نہیں موڑنا چاہیے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ''ہماری کمیونٹی کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے؟'' میرے خیال میں ہمیں ایک ایسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے جو دنیا کے معاملات چلانے میں ہماری بہترین مددگار بن سکے جو آنے والی نسلوں کو روزگار کے حصول میں مدد دے سکے۔

سر رضا علی نے متنبہ کیا کہ تعلیم یافتہ مسلم مڈل کلاس کی ضرورت اس مفروضہ میں نہیں ہے کہ انہیں حقیقی اسلام کی جانب جانا چاہیے اور ایک ایسی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لانا چاہیے جس کی قیادت ملا کر رہے ہوں بلکہ ان کی اہم ضرورت یہ ہے کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو دنیاوی مسائل کے حل کی جدوجہد میں مددگار ہو اور ان کی آنے والی نسلوں کو روزگار کی ضمانت دے سکے۔ انہوں نے سیکولر نظریات پر مبنی مسلم نیشنلزم کا خیال دیا جو کہ مسلم پیشہ ور اور تنخواہ دار کے مفادات کا ٹھیک ٹھیک ترجمان تھا۔ اب شبلی نعمانی کو علی گڑھ چھوڑنا ہی تھا کیونکہ وہ جگہ نہ تھی جہاں ان کی ملائیت پر مبنی خیالات پنپ سکتے جبکہ مسلم لیگ کی حمایت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور نئے طبقات کی حمایت بھی متوازی طور پر ملنا شروع ہوئی اور سماج کے نسبتاً نچلے اور معمولی حصوں سے بھی لوگوں کی بڑی تعداد مسلم لیگ میں شامل ہونے لگی جبکہ اس میں شامل ہونے والوں کی نہایت ہی قلیل تعداد دولت مند اور زمین دار طبقہ سے بھی تعلق رکھتی تھی۔

فرانسس رابنسن (Francis Robinson) کے مطابق ان میں شامل ہونے والوں میں ایک بڑی تعداد اس طبقے کی تھی جو اپنی زمین کے کرائے کی مد میں معمولی رقم حاصل کرتے جبکہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے نوکری بھی کرتے یا کسی پیشے سے منسلک ہوئے۔ یہ مسلم اشرافیہ طبقہ کا کم مراعات یافتہ حصہ تھا۔ اسی حصہ میں مسلم لیگ نے اپنی طبقاتی جڑیں بنائیں جبکہ اعلیٰ خاندانوں کے تنخواہ دار افراد کچھ زمیندار مثلاً راجہ صاحب محمد آباد اور چند تجارت پیشہ لوگ مسلم لیگ میں اب بھی اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

ان طبقاتی بنیادوں کی تبدیلی کی بنا پر مسلم لیگ کی رہنمائی علی گڑھ کی رجعت پسندی سے نکل کر لکھنو میں رہنے والی نسبتاً ریڈیکل قیادت کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مسلم لیگ کا مرکزی آفس بھی لکھنو میں منتقل ہو گیا۔ 1912ء میں وزیر حسن جیسے ریڈیکل اور متحرک شخص مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری بن گئے۔ مسلم لیگ کی سیاست کے طریقہ کار کا ایک نیا دور شروع ہوا اور کانگریس پارٹی سے متعلق رویہ میں تبدیلی آئی۔ اس حقیقت کو مسلم لیگ نے تیزی سے سمجھنا شروع کیا کہ کانگریس سے متحدہ فرنٹ بنائے بغیر برطانوی نو آبادی نظام سے نجات ممکن نہیں۔ یوں ہندو مسلم اتحاد وقت کی ضرورت بن گیا۔ مسلم لیگ کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان دونوں کے درمیان پل کا کام کرے اور محمد علی جناح ہی وہ شخصیت ہو سکتے تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس میں بااثر حیثیت کے مالک تھے۔ یوں وہ اس مقام پر تھے کہ دونوں تحریکوں کو یکجا کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ جب اکتوبر 1931ء میں وزیر حسن اور مولانا محمد علی سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے انڈیا سے ملاقات کے لیے لندن گئے (سیکریٹری نے ملنے سے انکار کر دیا تھا) تو انہیں موقع میسر آیا کہ وہ جناح سے مل سکیں۔ انہوں نے جناح صاحب کو قائل کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور لیگ کانگریس اتحاد کے لیے کام کریں۔ جناح صاحب نے اس شرط کے ساتھ مسلم لیگ میں شمولیت کا عندیہ دیا کہ کانگریس سے ان کے تمام تعلق قائم رہیں گے۔

جناح نے کانگریس۔ لیگ اتحاد کے لیے انتھک کوشش کی جس کے نتیجے میں لکھنو معاہدہ طے ہوا جس کی منظوری 1916ء میں دونوں جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں دی گئی۔ اس معاہدے کی رو سے کانگریس نے مسلمانوں کے بعض مطالبات بشمول مسلمانوں کے علیحدہ ووٹ کے بنیادی مطالبہ کو تسلیم کیا۔ اس مطالبے کی گوکھلے نے بھی بھرپور حمایت کی تھی۔ اس معاہدے نے مسلمانوں

کوصوبوں کے لحاظ سے Weightage بھی دیا جوکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے نزدیک خاصا متنازعہ رہا۔ مسلم اقلیت والے صوبوں جیسا کہ یوپی میں نشستوں میں اضافہ منٹو مارلے اصلاحات (Minto-Morley Reforms) میں حاصل ہونے والے اضافے سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ اضافہ مسلم اکثریت والے صوبوں کی قیمت پر ہوا۔ بنگال جہاں مسلمانوں کی آبادی 52% تھی، انہیں نشستوں میں صرف 40% دیا گیا جبکہ پنجاب جہاں مسلمانوں کی آبادی 55% تھی، انہیں 50% نشستیں دی گئیں جبکہ یوپی میں جہاں اب مسلمانوں کی آبادی میں تناسب 14% تھا انہیں نشستوں میں 30% حصہ ملا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سارا کھیل چلانے والے یوپی کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنو معاہدے کا یہ رخ ہی سب سے زیادہ متنازعہ رہا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ووٹ کے حق کو مانا کیونکہ مسلمانوں کو یقین تھا کہ مشترکہ انتخابات میں جائیداد کی شرط کی بنا پر کہیں سے بھی منتخب نہیں ہوسکیں گے یہاں تک کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں سے بھی منتخب نہ ہو پائیں گے۔ علیحدہ انتخاب کی یہ شق کانگریس قیادت کی نئی نسل کے لیے نہایت تکلیف کا سبب بنی۔ لکھنو معاہدے پر جائز تنقید کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں کانگریس اور مسلم لیگ ایک پلیٹ فارم سے برطانوی سامراج سے لڑنے کے لیے متحد ہوئے۔ یہ مسلم لیگ اور جناح ہی تھے جنہوں نے اتحاد کے لیے کوششوں کی ابتدا کی اور کانگریس نے اس کا مثبت جواب دیا۔ جناح کا کردار جوڑنے والے تھا نہ کہ جدا کرنے والے کا اور یہی اس کی عمومی پہچان تھی۔ وہ اپنی اس پیچیدہ کردار کو تمام مشکلات کے باوجود تقریباً ربع صدی تک نبھاتے رہے۔ یہاں تک ایک ایسا مقام آپہنچا جب تمام کوششوں کے باوجود اتحاد سیاسی ضرورت نہ رہا۔

لکھنو معاہدہ صرف مسلمانوں کے مطالبات سے متعلق ہی نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعے جماعتیں متحد ہوکر نوکرآبادیاتی حکمرانوں سے لڑرہی تھیں۔ مشترکہ مطالبات بھی کیے گئے تھے اس معاہدے کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ لیجسلیٹو کونسل (Legislative Council) میں منتخب ممبروں کی اکثریت ہو صوبوں میں 4/5 منتخب اور 1/5 نامزد ممبر ہونے چاہیے اور کونسل کے ممبر براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب کیے جائیں۔ عوامی رائے کے برخلاف لکھنو معاہدہ صرف مسلمانوں کو سیاسی رعایتیں دینے سے ہی متعلق نہ تھا بلکہ یہ ایک ایسا راستہ بھی تجویز کرتا تھا جس پر

چل کر نوآبادیات مخالف آزادی کی جدوجہد متحد ہو کر لڑی جا سکتی تھی۔ لکھنو معاہدے کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی عمومی طور پر جانی جاتی ہے۔ لکھنو معاہدے پر مبنی سیاست کو خلافت تحریک (24-1918) نے نشانہ بنایا جس کی بنیادی قوت ملا تھے۔ اس سے پہلے مذہبی نظریات مسلمانانِ ہند کی سیاست میں موجود نہ تھے۔ خلافت تحریک کے نتیجے میں مسلم لیگ کی قیادت میں تبدیلی آئی۔ جناح اور وزیر حسن جیسے سیکولر کو مسلم لیگ کی قیادت سے نکال باہر کیا گیا اور مولانا شوکت علی جیسے دوسرے درجے کے رہنما اعلیٰ قیادت میں آ گئے جبکہ مہاتما گاندھی ہی خلافت تحریک کے حقیقی رہنما تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں وہ ''تحریک کے ڈکٹیٹر'' تھے۔ اس تحریک میں ان کے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محل جیسے جذباتی ملا بھی شامل تھے اور وہ تحریک کے ہر زینہ پر گاندھی جی سے پوچھتے کہ انہیں بتایا جائے کہ وہ کیا کریں۔ گاندھی جی کی قیادت میں خلافت تحریک ایک بااثر قوت بن کر ابھری۔ گاندھی جی نے دعویٰ کیا کہ اس تحریک کے ذریعے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو قائم کرایا ہے۔ یہ لکھنو معاہدے کے برعکس ایک جھوٹا اور کھوکھلا دعویٰ تھا کیونکہ 1920ء میں خلافت تحریک کے اختتام پر پرتشدد ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ لکھنو معاہدہ جس نے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اتحاد کے لیے کام کیا کہیں راستے ہی میں کھو کر رہ گیا۔

یہ سچ ہے کہ مسلم لیگ صرف ایک چھوٹی سی مسلم اشرافیہ کے مفادات کی نمائندگی کرتی تھی اور اس نے کبھی بھی مسلم عوام، مزدوروں اور کسانوں سے بہت زیادہ تعلق نہیں رکھا تھا اور ملا جو کہ خلافت تحریک کی پشت پر قوت تھے انہوں نے بھی کبھی مسلمان کسانوں اور مزدوروں کے مطالبات کے لیے آواز نہیں بلند کی کیونکہ وہ خود درمیانہ طبقہ (پیٹی بورژوا) کے ایسے ریڈیکل تھے جو مستقبل کی ایک ایسی سمت جس طرف مسلمانوں کو سارے ہندوستان کے ساتھ مل کر جانے کی ضرورت تھی کی بات کرنے کے بجائے مردہ ماضی کی نمائندگی کر رہے تھے۔

خلافت تحریک کا سب سے زیادہ نقصان مسلم لیگ کو ہوا اور اس کے اثرات زائل کرنے میں اسے تقریباً ایک دھائی سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ وہ اس عرصہ کے دوران صرف نام کی حد تک خلافتوں کے سائڈ شو کے طور پر موجود رہی۔ ترک ریپبلکن قوم پرستوں جن کی قیادت مصطفیٰ کمال کر رہے تھے کے ہاتھوں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے اعلان کے بعد ہندوستان میں خلافت تحریک ایک شکست خوردہ مقصد بن کر رہ گئی۔ اس تحریک کے مسلم سیاست پر کوئی مستقل اثرات نہ پڑے

سوائے اس کے کہ ملاؤں کو مسلم لیگ کے خلاف منظم ہونے میں اس تحریک نے معاونت دی۔ گاندھی نے سخت گیر مسلم ملاؤں (نام نہاد دیو بندیوں) کو جمعیت علما ہند کے نام سے سیاسی تنظیم قائم کرنے میں مدد فراہم کی جبکہ ضعیف الاعتقاد لیکن روادارانہ سوچ کے حامل بریلویوں نے خلافت تحریک میں کوئی کردار نہیں ادا کیا کیونکہ وہ خلافت عثمانیہ کی قانونی حیثیت کو اس لیے تسلیم نہیں کرتے تھے کہ عثمانیہ حکمران قریش سے نسلی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ یہاں جمعیت علما ہند کے ساتھ دو اور انتہا پسند سوچ کے حامل ملاؤں کی جماعتیں، جماعت اسلامی اور مجلس احرار بھی ابھر کر سامنے آئیں اور یہ تینوں ہی مذہبی جماعتیں مسلم لیگ اور اس کی مغربی تعلیم یافتہ قیادت کے خلاف تھیں اور انہوں نے واقعتاً پاکستان کے قیام کے مطالبے کی مخالفت کی تاہم یہ مذہبی جماعتیں مسلم لیگ کو روکنے کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہیں اور خصوصی طور پر اس وقت جب سندھ، پنجاب اور مشرقی بنگال کے جاگیرداروں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی۔

یہ وہ وقت تھا جب جناح جیسے سیکولر خیالات کے حامل افراد نے مسلم لیگ میں دوبارہ شمولیت اختیار کر لی اور مسلم لیگ نے مسلم اقلیت والے یوپی صوبے سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو اپنی سیاست کا محور بنانے کی پالیسی پر عملدر آمد شروع کیا۔ یہ تبدیلی بنیادی طور پر مونٹیگ چیلمس فورڈ اصلاحات (Montague-Chelmsford Reforms) کے تحت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء کی وجہ سے آئی کیونکہ اس ایکٹ کے تحت صوبائی سطح پر چند محکموں سے متعلق محدود اختیارات ہندوستانی وزرا کے حوالے کیے گئے تھے۔ اس صورت حال نے ہندوستان کی سیاست میں ایک نئی صورت حال پیدا کر دی اب ریاستی اعانت کی ہندوستانی وزرا کے ذریعے تقسیم نے سیاسی جماعت کے حصول میں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ یوپی صوبہ کے مسلمان جو کہ مسلم لیگ کی طاقت کی بنیاد تھے اب سیاسی کھیل سے باہر ہو گئے۔ کیونکہ وہ اقلیت میں تھے۔ دوسری طرف پنجاب صوبے میں جہاں مسلم لیگ صرف نام کی حد وجود رکھتی تھی باوجود اس کے کہ یہ مسلم اکثریت صوبہ تھا۔ پنجاب پر مسلم جاگیردار ہندو اور سکھ جاگیرداروں اور مشرقی پنجاب کی جٹ برادری جس کی قیادت سر چھوٹو رام کر رہے تھے کہ ساتھ مل کر یونینسٹ پارٹی کے جھنڈے تلے حکومت کر رہے تھے۔ اس پارٹی کے سربراہ سر فضل حسین تھے جو کہ جاگیردار نہ تھے مگر جاگیرداروں سے بہتر ان کے مفادات اور ضروریات کے بارے میں جانتے تھے۔ جاگیرداروں کے طبقاتی مفادات کے علاوہ

یونینسٹ پارٹی کے نظریات میں پنجابیت بھی شامل تھی اور یہ پارٹی چاہتی تھی کہ انگریز ہمیشہ ہی ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا تھا کہ اس پارٹی کا مقصد پنجاب پر حکمرانی تک محدود تھا لیکن جب آزادی کے آثار نظر آنا شروع ہوئے تو فضل حسین کے جانشیں سر کندر حیات نے تاج برطانیہ کے تحت آزاد پنجاب کے قیام کے لیے چرچل (Churchill) کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن حالات کے دھارے میں یہ پروجیکٹ اہمیت حاصل نہ کر سکا۔

سر فضل حسین نے کامیابی کے ساتھ پنجاب مڈل کلاس کو دو مختلف گروہوں یعنی دیہی اور شہری میں تقسیم کر دیا تھا۔ دیہات سے تعلق رکھنے والے تنخواہ دار پیشہ ور جنہیں جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی ہمیشہ نوازے گئے اور اہمیت کے حامل رہے جبکہ شہر سے تعلق رکھنے والا مسلم گروہ پسماندہ اقلیت بن کر رہ گیا۔ اس تلخ سماجی ناانصافی کے جواب میں بہت سوں نے نعرہ باز بنیاد پرست مذہبی گروپ ''مجلس احرار'' میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت تک پنجاب میں مسلم لیگ کو کوئی سنجیدہ مخالف پارٹی کے طور پر نہیں لے رہے تھے جو یونینسٹ پارٹی کے صوبے پر اقتدار کو چیلنج کر سکے۔ اس لیے انہوں نے اسے برداشت کیا اور کسی حد تک منظم ہونے میں مدد فراہم کی تاکہ جب ضرورت پڑے تو اسے استعمال کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ سر سکندر حیات نے جناح سے ایک معاہدہ بھی کیا۔ یہ چالیس کی دہائی کے درمیان کا زمانہ ہے کہ جب آزادی کے آثار حقیقت بننا شروع ہوئے تو پنجابی جاگیردار طبقہ نے دو باتیں محسوس کر لیں پہلی یہ کہ برطانیہ کی دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے ایک آزاد پنجاب اب ممکن نہیں ہے جو کہ وہ چاہتے تھے اور دوسرا یہ کہ اگر کانگریس کے زیر قیادت آزادی ملتی ہے تو پنجاب میں بطور جاگیردار طبقہ ان کی بقا خطرے میں ہے کیونکہ نہرو کی سربراہی میں قائم کمیٹی نے کئی برسوں کی سوچ بچار کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں زرعی اصلاحات پر عمل کرے گی۔ لہٰذا پنجاب کے جاگیرداروں نے اپنی طبقاتی بقا کے لیے مسلم لیگ کی زیر صدارت پاکستان کو ایک قابل عمل متبادل کے طور پر تسلیم کیا اور وہ اس لیے بھی کہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آسانی سے اس پر قبضہ کر کے اسے کنٹرول کر سکتے تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ ان جاگیرداروں میں سے پہلے تھے جنہوں نے 1943ء میں مسلم لیگ جوائن کی اور 1945ء تک تقریباً تمام مشہور جاگیرداروں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی سوائے چند ایک کے جو خضر حیات خان کے ساتھ دولت مشترکہ (Common Wealth) میں آزاد پنجاب کے خواب

کی تکمیل کے متمنی تھے جو کہ انگریز نہیں چاہ رہا تھا۔ سندھ کی صورت حال بھی پنجاب جیسی ہی تھی۔ آزادی کے لمحات آنے تک پنجاب اور سندھ میں جاگیردار مسلم لیگ پر مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ مفادات کے علاوہ جاگیرداروں کے لیے کوئی دوسری نظریاتی وجوہ موجود نہ تھی جس کی بناپر انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

پاکستان کی تحریک کسی بھی مذہبی نظریہ کی بنا پر نہیں چلائی گئی۔ سندھ اور پنجاب کے کئی پیر بڑے بڑے جاگیردار تھے جنہوں نے پاکستان کی حمایت کی۔ ان کی وجہ سے ان کے مریدوں نے بھی پاکستان کے قیام کی پرجوش حمایت کی۔ یہی وہ وجہ ہے کہ بعض دانشوروں نے یہ جھوٹا تاثر لیا کہ یہ پاکستان کا خیال ہی تھا جس نے ان مریدوں کو متحرک کیا جب کہ سچائی یہ تھی کہ وہ سب کچھ اپنے پیر کی خوشی کے لیے کر رہے تھے۔ جب پیر نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تو لامحالہ اس نے کانگریس کی زرعی اصلاحات کے خطرے سے جان چھڑالی۔ حقیقت میں پنجاب میں اسلامی نظریہ کو مجلس احرار کے ذریعے لایا گیا جو مسلم لیگ کی سخت مخالف تھی اور اس کے رہنماؤں کو کافر قرار دیتی تھی۔ پنجاب میں یہ واحد تحریک تھی جو اسلام کے نام پر کچھ اثر رکھتی تھی اور پاکستان کے نظریے کی شدت سے خلاف تھی۔ مجلس احرار کی جڑیں بنیادی طور پر پنجاب کے اس شہری درمیانی طبقہ (پیٹی بورژوازی) اور نچلے درمیانی طبقہ میں تھیں جسے یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) پارٹی کی شہری مخالفت پالیسی کی بنا پر بری طرح نظر انداز کیا گیا اور اسی یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) نے مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ لائحہ عمل بنایا۔ یہ صرف بنگال ہی تھا جہاں 1945ء کے الیکشن میں مسلم لیگ نے حقیقی معنوں میں عوامی مینڈیٹ حاصل کیا۔ 1937ء کے الیکشن تک بنگال میں مسلم لیگ ڈھاکہ کے نواب خان اور ان کے گرد جمع درباریوں کے کنٹرول میں رہی۔ جس کو فضل حق کی زیر قیادت کرشک پروجا پارٹی (Krishak Paroja Party) نے چیلنج کیا اس پارٹی کی بنیاد کھاتے پیتے کسانوں پر تھی۔ 1937ء میں ہونے والے انتخابات کے حتمی ووٹ دونوں جماعتوں میں برابر تقسیم ہوئے جس کی بنا پر مشترکہ حکومت بنانی پڑی۔

بنگال میں 1943ء کے بھیانک قحط کے نتیجے میں 35 لاکھ غریب بنگالی کسان ہلاک ہوئے کیونکہ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس صورت حال کے خلاف جلد ہی بنگال کسانوں نے جنگجویانہ طبقاتی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ کسانوں کی یہ تحریک تبھاگا تحریک ( Tebhaga

Movement) کے نام سے مشہور ہے۔اس کی قیادت کمیونسٹوں کی آل انڈیا کسان سبھا ( All India Kisan Sabha) نے کی۔یہ بنگال کا وہ معاشی وسیاسی پس منظر تھا جس میں کسان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اسی دوران 1945ء میں انتخابات کا انعقاد ہوا۔1943ء میں ایک یاد رہنے والی شخصیت کے مالک عبدالہاشم بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے جنہوں نے اسلام اور سوشلزم کا کنفیوز سا مکسچر پیش کیا۔انہوں نے نواب ڈھاکہ کے خاندان اور دیگر اعلیٰ طبقات کے افراد کو مسلم لیگ کی قیادت سے باہر کر دیا اور مسلم لیگ کی الیکشن مہم عوامی سطح پر منظم کی اور سارا زور ٹھوس عوامی ضروریات اور چھوٹے کسانوں کے معاشی مانگوں پر دیا۔عبدالہاشم نے کسانوں کو مسلم لیگ کے ساتھ لا کھڑا کیا انہوں نے خالص طبقاتی نعروں کے ذریعے کسانوں کو متحرک کیا نہ کہ مذہبی نعروں پر۔

بنگال کی 1945ء کی الیکشن مہم میں مذہبی نظریہ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔یہ تمام کا تمام کسانوں کے معاشی مطالبات پر لڑا گیا اور عبدالہاشم کے شخصی طلسم نے معاشی مطالبات کو مذہبی نعرے میں تبدیل ہونے سے روکے رکھا۔حالانکہ بنگال کے کسان جو کہ زیادہ تر مسلمان تھے ان کا گزر بسر جوٹ جیسی نقد آور فصل پر تھا اس لیے وہ بین الاقوامی نقد آور معیشت سے جڑے ہوئے تھے۔لہٰذا ان کا براہ راست تضاد تاجروں اور سودخوروں سے تھا جو کہ ہندو تھے۔عبدالہاشم نے ان ایشوز کو معاشی طبقات کے حوالے سے اٹھایا اور انہیں مذہبی تضاد میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔انہوں نے کسانوں سے وعدہ کیا کہ مستقبل کے پاکستان میں حکومت ان کی ہوگی ان پر قرضوں کے بوجھ کو کم کیا جائے گا اور ایسا طریقہ کار اپنایا جائے گا کہ تاجر کسانوں کے مفادات کے خلاف اجناس کی قیمتوں میں ردوبدل نہ کرسکے۔کسانوں سے یہ بھی وعدہ کیا کہ زمین داری نظام ختم کر دیا جائے گا۔ بنگال کے کسانوں نے سمجھا کہ پاکستان میں کسانوں کا راج ہوگا۔یہ سب کچھ جاگیردارانہ سندھ اور پنجاب سے مختلف تھا۔عبدالہاشم کی کامیاب مہم کے نتیجے میں مسلم لیگ کو بنگال کی صوبائی اسمبلی کی 121 مسلم نشستوں میں سے 114 نشستوں پر کامیابی ہوئی اس ساری صورت حال میں مذہبی نظریات نے کوئی کردار نہیں ادا کیا۔نعرہ بازی کی حد تک بھی نہیں لیکن ہوا یہ کہ ہمیشہ کی طرح کسانوں سے دھوکا ہوا۔عبدالہاشم کا کام پورا ہو چکا اور طاقتور ڈھاکہ نواب گروپ کو فروری 1947ء میں انہیں مسلم لیگ کی قیادت سے ہٹانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔بنگال کے مسلم

جاگیردار ایک بار پھر واپس آ گئے یہ خود ایک لمبی مگر دکھ بھری کہانی ہے۔ اب آخری نتیجے کے طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان پر حاوی طبقات میں ایک جاگیردار تھے۔ دوسری جانب بیوروکریسی تھی۔ پنجاب اور سندھ میں جیسا کہ ہم نے دیکھا جاگیردار جیتے اور انہوں نے اپنی جاگیردارانہ روایات ہم پر دہائیوں سے تھوپی ہوئی ہیں۔ بنگال میں ساری بھرپور عوامی حمایت کے باوجود یہ بنگال کے مسلم جاگیردار ہی تھے جو بٹوارے کے وقت دوبارہ اقتدار میں واپس آ گئے۔ جب پاکستان وجود میں آیا اس وقت اس کا مسئلہ مذہبی نظریہ نہیں بلکہ جاگیردارانہ بالادستی تھی۔ آج کے ملا جس طرح کے دعوے کرتے ہیں اس کے برعکس مسلم لیگ سوائے خلافت تحریک کے ایک مختصر دورانیہ کے اپنے سارے سیاسی کیریئر کے دوران مستقل مزاجی سے سیکولر نقطہ نظر پر قائم رہی۔

اسلامی نظریہ کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کرنے کی کچھ حقیری کوششیں ضرور ہوئیں مگر یہ نہ ہونے کے برابر تھیں اور حقیقتاً بری طرح ناکام ہوئیں۔ ایک ایسی ہی کوشش کو مثال کے طور پر شریف الدین پیرزادہ نے اپنی ''مسلم لیگ دستاویز'' میں محفوظ کیا۔ جب اسلامی نظریہ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ایجنڈے پر لانے کی کوشش کی گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے 1943ء کی دہلی میں ہونے والے اجلاس میں ایک شخص عبدالحمید قاضی ایک قرارداد کی حمایت کے لیے کوشش کر رہے تھے کہ مسلم لیگ کو اسلامی نظریہ اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لیے پابند کیا جائے لیکن اس کے فوری ردعمل میں مسلم لیگ کے اجلاس میں موجود ہر شخص نے قاضی پر اتنا دباؤ ڈالا کہ انہوں نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ مذہبی جماعتوں کے مذہبی نظریات کی مخالفت ہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر یہ جماعتیں مسلم لیگ کی قیادت اور پاکستان کے قیام کی شدید مخالف تھیں۔ مغربی تعلیم یافتہ مسلم پروفیشنل تنخواہ دار طبقہ اور (فائنل راؤنڈ میں جاگیردار) جنہوں نے پاکستان بنانے کے لیے عوامی حمایت کو متحرک و منظم کیا ان کے محدود سیاسی نظریات کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن مذہبی نظریات کبھی بھی ان کی تحریک کا حصہ نہ تھے۔ جب محمد علی جناح نے پاکستان کے سیکولر نظریہ کا اعلان کیا تو وہ مسلم لیگ کی اس بنیادی نظریاتی پوزیشن کو بیان کر رہے تھے جو اس تنظیم نے اپنی ساری تاریخ میں اپنائے رکھی اور پاکستان کی بنیادیں اٹھانے میں بنیاد پرست اسلامی نظریہ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصورِ قومی زبان

ڈاکٹر وزیر آغا

خواتین و حضرات!

جب بھی قائداعظم کے حوالے سے اُردو زبان کی قومی حیثیت کا ذکر چھڑا ہے تو اذہان کا رخ ازخود ان تقاریر کی طرف منعطف ہوگیا ہے جو قائداعظم نے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکا کے جلسۂ عام میں اور پھر 24 مارچ کو جلسۂ تقسیمِ اسناد ڈھاکا یونی ورسٹی کے موقع پر کی تھیں اور جواَب اُردو دانوں کو قریب قریب ازبر ہو چکی ہیں۔ قائداعظم نے فرمایا تھا:

''پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ اُردو ہی ہوگی۔''

اور

''اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے ہے اُردو صرف اُردو ہے۔''

ان تقاریر کا حوالہ دے کر بیشتر لوگ اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ قوم نے قائداعظم کے فرمان کا احترام نہ کیا اور اُردو کی قومی حیثیت کو تسلیم نہ کیا مگر کیا واقعی؟ کیونکہ آج تک شاید کسی ایک موقع پر بھی کسی سرکاری افسر یا سیاسی لیڈر نے قائداعظم کی خواہش اور رائے کو مسترد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اب تک پاکستان کے جتنے بھی دستور آئے ہیں۔ ان سب میں اُردو کی قومی حیثیت کو بلا چون و چرا تسلیم کرلیا گیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ نہیں کہ قوم نے قائداعظم کے فرمان کا احترام نہ کیا بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ اُردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے بعد اسے آج تک وہ مقام اور درجہ کیوں نہ دیا گیا جو اس کا قانونی اور قدرتی حق تھا مگر یہ سوال ابھی نہیں اُٹھاؤں گا بلکہ مختصراً

صرف اس قدر کہنے کی جسارت کروں گا کہ پچھلے تیس برسوں میں اُردو کو اس کی مسند سے دور رکھ کر ہم نے اس کا برا حال کر دیا ہے اور اپنی قومی زبان سے فائدہ اُٹھا کر ہم نے قومی ترقی کے راستے میں کتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

آج سے بہت عرصے پہلے جب اُردو کی قومی حیثیت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا اعلان بھی کیا گیا کہ آئندہ بیس برس تک سرکار و دربار کی زبان بدستور انگریزی رہے گی جب کہ اُردو زبان اس عرصے میں ورزش اور ریاضت سے اپنی صحت بنائے گی تا کہ وہ انگریزی کی جگہ لے سکے تو مولانا صلاح الدین احمد نے بڑے کرب کے ساتھ کہا تھا کہ اُردو کے طفلِ نوخیز کو بیس برس کی نیند سلا دیا گیا ہے لیکن جب وہ اس نیند سے بیدار ہوگا تو کیا وہ اپنے ماحول کو پہچان بھی سکے گا؟ مولانا نے اس وقت جو بات کہی تھی وہ آج سو فیصد درست دکھائی دیتی ہے لیکن اگر اس وقت مولانا یہ بھی کہہ دیتے کہ بیس برس کی نیند کے بعد اُردو زبان خود کو بھی پہچان نہ سکے گی تو ان کی یہ بات بھی ایک بڑی حد تک درست ہوتی کیونکہ خواتین و حضرات! ان بیس برسوں میں انگریزی کی بالا دستی نے اُردو زبان کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ لکھنے کی زبان کا تو جو حال ہوا سو ہوا لیکن بولنے کی زبان پر انگریزی الفاظ کی چاند ماری اتنے تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوئی ہے کہ اب اس کا دامن، دامنِ صد چاک کا منظر دکھاتا ہے۔ اگر انگریزی کے الفاظ اُردو زبان کے بناؤ میں اس حد تک ہی شامل ہوتے جس حد تک خود انگریز برصغیر کے معاشروں میں جذب ہوئے تھے۔ تو میں کہتا کہ یہ الفاظ تو ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور اُردو کی روشنائی میں اضافے کا موجب ہیں مگر آج یہ صورت ہے کہ جیسے سر پر ایک سائبان سا تنا ہو جس میں سوراخ ہی سوراخ ہوں اور سورج کی روشنی ان سوراخوں سے اس طور پر عکس ریزی ہو کہ وہ ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیں مگر سب جانتے ہیں کہ یہ سوراخ ہیں ستارے نہیں ہیں نیز یہ کہ سائبان چھلنی ہو چکا ہے۔ ہر لفظ ایک ذی روح کی طرح ہوتا ہے، اس کی ایک شخصیت، ایک اپنی داستانِ حیات ہوتی ہے اور انھیں اپنی عمرِ طبعی ہنس یا رو کر گزار دینے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے مگر جب یوں ہو کہ کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ کو اتنی قوت اور حق مل جائے کہ وہ ملکی زبان کے الفاظ کو دھکے دے کر ان کی مسندوں سے نیچے گرائے اور ان کی جگہ قابض ہو جائے اور یہ سلسلہ ایک بہت بڑے پیمانے پر جاری ہو تو پھر جلد یا بدیر ملکی زبان کے الفاظ پہلے

تو اپنے قومی اور تہذیبی تشخص سے محروم ہوں گے اور آخر میں غلاموں کی طرح سر بہ سجود دکھائی دیں گے۔ بالکل یہی حال اُردو الفاظ کا بھی ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ تو داعیِ ملکِ عدم ہوئے، کچھ کو ان کی مسندوں سے نیچے اُتار دیا گیا اور باقی مارے شرم کے منہ چھپائے پھر رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں انگریزی کے الفاظ معاشرے میں دندناتے پھر رہے ہیں اور عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ غلامی کی صورت محض یہی نہیں کہ وطنِ عزیز پر کسی اجنبی حکومت کا تسلط ہو۔ اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ ملکی تہذیب اجنبی تہذیب کے سامنے دم توڑنے لگے اور ملکی زبان اور اس کے الفاظ اجنبی زبان اور اس کے الفاظ کے سامنے بے توقیر ہو جائیں۔ آج حالت یہ ہے کہ اُردو کی محفل میں انگریزی کے ٹاٹ کے پیوند لگانا شخصی برتری کے اظہار کا اعلامیہ بن چکا ہے۔ اس حد تک کہ اَن پڑھ دیہاتی بھی انگریزی الفاظ اپنی زبان میں شامل کر کے اپنے سے زیادہ اَن پڑھ دیہاتیوں پر رعب ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ بے شک ابھی دکانوں کی پیشانیوں پر اُردو رسم الخط میں دکان کا نام لکھنے کا چلن باقی ہے لیکن نام تبدیل ہو گئے ہیں۔ میرے اپنے گاؤں کے دسویں پاس معالج نے اپنی دس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی کچی کوٹھڑی کی پیشانی پر ''گل میڈیکل ہال'' کے الفاظ لکھ لیے ہیں اور اب یہ مرض محض اکادکا کوٹھڑیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ کوٹھوں پر چڑھ کر ایک وبا کی طرح پورے ملک میں پھیل گیا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسکولوں، کالجوں، بازاروں، ہوٹلوں، دفتروں اور اداروں میں ہر جگہ ایک ایسی زبان مروّج ہو رہی ہے جسے کہنے کو تو ہم اُردو ہی کہیں گے کیونکہ اپنی قدیم روایات کے احترام میں اس نے بدیسی الفاظ کو خوش آمدید کہا ہے مگر چونکہ یہ سب کچھ ایک قدرتی عمل کے انجذاب کے ذریعہ نہیں بلکہ ایک مصنوعی صورتِ حال کے ذریعہ ہوا ہے اس لیے اُردو زبان، انگریزی اور اُردو الفاظ کا ملا جلا ڈھیر سا بن گیا ہے۔ نہ کہ ایک ایسا ہار جس میں الفاظ موتیوں کی طرح پروئے گئے ہوں اور یہ ساری افسوس ناک صورتِ حال محض اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے اُردو کو معاشرے کی جملہ سطحوں پر پوری طرح رائج کرنے کے سلسلے میں تاخیر کر دی ہے اور اس کے مقابلہ میں انگریزی زبان کو عزت اور توقیر بخشنے کے علاوہ ترویج و اشاعت کے بے پناہ مواقع بھی مہیا کر دیئے ہیں۔

خواتین وحضرات!

پاکستان میں انگریزی کی اس بالادستی نے اُردو زبان ہی نہیں، پاکستانی معاشرے کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ اُردو زبان کو نقصان یوں کہ برق رفتاری کے اس دور میں اُردو کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ براہونے میں کامیاب ہوتی اور اس طرح خود میں اتنی ہی کشادگی اور توانائی پیدا کرسکتی جتنی دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں مشاہدہ کی جاسکتی ہیں۔ علم الحیات کا یہ ایک ادنیٰ سا اصول ہے کہ جس عضو کو استعمال نہ کیا جائے وہ بالآخر ناکارہ ہوکر متروک ہوجاتا ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ اگر اسے چند سالوں کے لیے کسی برف خانے میں رکھ دیا جائے تو وہ زمانے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گی۔ زبان تو دفتروں میں، درس گاہوں میں، بازاروں میں اور گلیوں میں بنتی اور بگڑتی ہے اسے ماہرین کی کسی جماعت کے سپرد کرکے توانا اور جدید نہیں بنایا جاسکتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اُردو کو اس کا قومی منصب اس وقت ملے گا جب یہ اس کے قابل ہوجائے گی۔ اس اعتبار سے قابلِ قبول نہیں کہ ہر لمحے کی تاخیر اُردو کو زمانے کی دوڑ میں پیچھے پھینک رہی ہے اور اگر تاخیر کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کچھ عرصے کے بعد اُردو اتنی پیچھے رہ جائے گی کہ قومی منصب کو سنبھالنے کے قابل ہی نہیں رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پہلے ہی بہت دیر کردی ہے۔ اگر اُردو کو معاشرے کی تمام سطحوں پر آغاز کار ہی میں رائج کردیا جاتا تو اس کی نشو ونما فطری انداز میں ہوتی اور یوں اس پر انگریزی الفاظ، محاوروں اور اصلاحات کی یلغار کا یہ عالم کبھی نہ ہوتا مگر پانی ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا، اگر آج بھی اُردو کو معاشرے کی جملہ سطحوں پر رائج کرنے کا آغاز ہوجائے تو اس میں اتنی سکت یقیناً ہے۔ وہ جلد یا بدیر اس فاصلے کو کم کرسکے جو اس کے اور زمانے کے درمیان حائل ہوگیا ہے۔

انگریزی کی بالادستی نے پاکستانی معاشرے کو نقصان یوں پہنچایا ہے کہ ہماری نئی پود اپنی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے جس تیزی سے آگے بڑھ سکتی تھی۔ وہ انگریزی زبان کو سیکھنے کے طویل عمل کے باعث وجود میں نہیں آئی۔ تمام ماہرینِ تعلیم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے طلبا کی ذہنی صلاحیت کا معیار وہ نہیں جو ہونا چاہیے تھا اور یہ محض اس لیے کہ وہ اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل نہیں کررہے ہے۔ بے شک تعلیم کے میدان میں اُردو کو محض چند جماعتوں میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر پورے نظامِ تعلیم کو سامنے رکھیں تو یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے

تھا کہ اُردو کے پکوان میں انگریزی کو بطور نمک شامل کیا جاتا مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ انگریزی کے پکوان میں اُردو کو نمک کی حیثیت ملی ہے۔

قائدِاعظم کا فرمان تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہو، ہم نے قائدِاعظم کا احترام کیا اور اپنے دستور میں اس کی قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا مگر قائدِاعظم کا تصورِ قومی زبان یہ تو نہ تھا کہ اُردو زبان زندگی بھر ایک نامزد صدر کی حیثیت میں رہے مگر اسے صدر بننے کا موقع فراہم نہ کیا جائے۔ ہم نے تاحال نامزدگی سے آگے کوئی قابلِ ذکر قدم نہیں اُٹھایا۔ سوال یہ ہے کہ یہ قدم کب اُٹھایا جائے گا؟

(قائدِاعظم اُردو کانفرنس لاہور میں پڑھا گیا)

◆◆◆

maablib.org

# قائد کا تصورِ اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر منظور احمد

پاکستان کو اب اپنے مفہوم و معانی، مدعا اور کردار کے حوالے سے ایک نظریہ کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اس پیش پا افتادہ بات کو ایک طویل عرصے سے اکتا دینے کی حد تک دہرایا جا چکا ہے اور اب اس کو ایک بدیہی صداقت سمجھا جانے لگا ہے۔ اس تصور کی متواتر جارحانہ وکالت نے ان تمام مساعی کو پس پشت ڈال دیا ہے جو خاص طور پر پاکستان کے علمی اداروں میں معروضی تجزیوں کے لیے کی گئیں۔ اس سے بعض مخصوص گروہوں کے علاوہ پاکستان کی ہیئت حاکمہ کے سیاسی مقاصد کو بھی تقویت ملتی رہی ہے۔ سنجیدہ دانشورانہ کوششوں کی غیر موجودگی میں پاکستان کا تصور ایک اشکال (aporia) ہی رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل تحریر میں اس تصور میں موجود الجھنوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پاکستان کی تخلیق جیسا کہ کہا جاتا ہے دو قومی نظریے پر منحصر ہے یعنی ہندو اور مسلمان جو ہندوستان میں نمایاں حد تک الگ اور مختلف قوموں کی حیثیت میں اور بعض ادوار میں باہم معاند ثقافتی گروہوں کے طور پر بودوباش رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ نزاعی یا بحث طلب مسئلہ ہے کہ ہندوستان میں دو ہی قومیں بستی تھیں، قطع نظر اس بات کے کہ ''قوم'' کی تشریح کس طرح کی جاتی ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سب سے بڑے گروہ ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کی تھے۔ ان دونوں ثقافتی گروہوں کی ہندوستان میں اپنی ایک تاریخ اور اپنا تہذیبی پس منظر ہے اور دونوں خود کو ایک منفرد تشخص کا حامل اور اپنے طور پر برتر سمجھتے ہیں جن کی اپنی مختلف خصوصیات ہیں۔ تاہم ہندوستان کی سیاسیات کے تناظر میں ہر گروہ کا تشخص اور اتحاد ایک دوسرے گروہ کی موجودگی سے تقویت پاتا تھا اگر خالی ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو لیں تو ان میں مزید قومیتوں، فرقوں، نسلی اور

لسانیاتی گروہوں میں ذیلی تقسیم تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کی تخلیق کا تصور تشکیل پانے میں خاصا وقت لگا جیسا کہ ہندوستان میں تحریک آزادی کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسلم لیگ جو تخلیق پاکستان کے لیے ذمہ دار جماعت تھی 1906ء میں اپنی تشکیل کے وقت ہی ایک ایسی جماعت کے طور پر تشکیل دی گئی تھی جو برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کے جذبوں کو ابھارے گی اور ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات اور سیاسی حقوق کا تحفظ کرے گی۔

لیگ کو علیحدہ ریاست یا ریاستوں کے تصور کو متشکل کرنے میں 34 سال کا عرصہ لگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تجربے نے ان کو سکھایا تھا کہ وہ اپنی ثقافت کے تحفظ کے لیے غیر منقسم ہندوستان میں ہندو قیادت پر بھروسہ نہیں کر سکتے چاہے انڈین نیشنل کانگریس اور گاندھی جی اپنے سیکولر اور انسان دوست ہونے کا کتنا ہی پرچار کریں۔

یہ مارچ 1940ء کی بات ہے جب قرارداد لاہور (یا پاکستان) منظور کی گئی جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں مسلمانوں میں عدم تحفظ کا شدید احساس موجود تھا سوائے مسلم بنگال کے جہاں 1905ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں ان کا الگ صوبہ بنایا گیا تھا۔ اس سے پیشتر وہاں بھی عدم تحفظ کا ویسا ہی احساس پایا جاتا تھا اور پھر اس وقت بھی جب بنگال کے دونوں حصوں کو پھر سے ملا دیا گیا۔ مسلم اکثریت کے علاقے جاگیردار اور قبائلی لیڈروں کے زیر اثر تھے۔ اگرچہ اقلیتی صوبوں کے مسلمان اس سوال کا واضح جواب نہ دے سکتے تھے کہ علیحدہ ریاست یا ریاستوں کے قیام سے مسلمانوں کا کس طرح تحفظ ہو سکے گا یا وہ کیونکر اس قابل ہوں گے کہ ان کی ثقافت اور مذہبی تشخص کو قائم رکھ سکیں۔ تاہم یہی وہ صوبے تھے جہاں مسلم لیگ زیادہ منظم تھی اور عوام میں اس کی گہری جڑیں تھیں۔ مسلم لیگ کی طرف سے بعد میں جو قرارداد منظور کی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے سے بخوبی آگاہ تھے لیکن پھر بھی اندازہ ہے کہ مسلم لیڈر اس صورت حال کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ تبھی تو وہ قرارداد میں لکھتے ہیں کہ ''آئین میں ان کے لیے اور دوسری اقلیتوں کے لیے کافی موثر اور انتخابی اقدامات کی گنجائش رکھی جائے گی تاکہ ان سے مشورہ کر کے ان کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔'' قرارداد کا انتدابی (mandatory) حصہ بالکل احمقانہ اور کھوکھلا (Vacuous) ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک

خواہش یا امید کا اظہار ہے کہ اقلیتوں کی ثقافتوں کو دونوں ریاستوں میں تحفظ دیا جائے گا۔

لیکن اس مسئلے میں اہم نکتہ یہ نہیں ہے کہ اس قرارداد کی منظوری کے وقت سیاسی حقائق کو سمجھنے میں کوتاہی ہوئی اور نہ یہ کہ ان واقعات کے متعلق پیش بینی کرنے میں خاصی کسر رہ گئی جو اگلے تقریباً پچاس سال کے عرصے میں پیش آنے تھے۔ نکتے کی بات یہ ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کی ذہانت اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہی کہ 1906ء میں مسلم لیگ کی تشکیل کے مقاصد کیا تھے اور پھر 1940ء میں اس کا موقف کیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں ایک فکری جست واقع ہوئی جس کے عواقب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔ اگر چہ سیاسی جماعتیں زندگی کے بدلتے ہوئے حقائق کے ساتھ اپنے موقف میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کرتی رہتی ہیں لیکن یہ تبدیلی بظاہر متناقص صورت حال پر منتج ہوئی۔ وہ لوگ جو بڑی سرگرمی سے تخلیق پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے وہ ایسے لوگ تھے جو اس کو حاصل کرنے والے نہ تھے اور جو لوگ مسلم بنگال کے سوا اکثریتی صوبوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ ابھی ایسے اقدام کی ضرورت کے قائل نہیں ہوئے تھے۔ مغربی ہندوستان کے کسی بھی اکثریتی صوبے میں مسلم رائے دہندگی کو موثر طور پر منظم نہیں کیا گیا تھا حتیٰ کہ چالیسویں دہائی کے تقریباً وسط میں گویا 1940ء کے خاصی دیر بعد پنجاب میں مسلم لیگ کو صرف 1946ء کے انتخابات میں کسی حد تک کامیابی نصیب ہوئی تھی، جہاں اس سے پہلے سالہا سال یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) نے حکومت کی تھی۔ مغربی علاقہ جات کے دیگر مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ یہ تبدیلی صرف اس وقت ہوئی جب جاگیردارانہ اور قبائلی لیڈروں کو احساس ہوا کہ غیر منقسم ہندوستان میں ان کا مستقبل غیر محفوظ ہوگا۔ تبھی انہوں نے مسلم لیگ کی چلتی گاڑی پر چھلانگ لگائی اور مذہب کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا تاکہ عوام کو جذباتی لحاظ سے اکسایا جائے کہ وہ مطالبہ برائے پاکستان کا ساتھ دیں۔ مطالبہ پاکستان کے بعد اس کے وجود میں آنے میں صرف 7 سال اور 5 مہینے لگے۔ یہ عرصہ شاید کسی بھی نو آبادیاتی حکومت کے خلاف آزادی کی تحریکوں کی تاریخ میں سب سے کم ہوگا۔ یہ درمیانی عرصہ بہت مختصر تھا اور پھر مذہبی ثقافت یعنی اسلام کی بنیاد پر ایک ریاست کا مطالبہ جامعیت اور گہرائی میں جا کر تجزیہ کا متقاضی تھا لیکن مسلمانوں کے دانشور طبقے کو اتنا بھی وقت نہ مل سکا کہ وہ اسلام کے اقداری نظام پر مبنی کسی ریاست کے تصور کو واضح اور متعین کرنے کی کوشش کرتے۔

ریاست کے اس جدت پسندانہ تصور میں جو اسلامی ثقافت پر مبنی ہے اور رجعت پسندوں کے ان روایتی اور مذہبی انداز کے خیالات میں بہت زیادہ فرق ہے جو دنیاوی اور فروعی اختلافات کے باوجود بڑی آسانی سے مسلمانوں کی اکثریت کے لیے قابل فہم اور قابل قبول ہیں۔

وہ لوگ جو تحریک پاکستان کی تاریخ سے واقف ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلی بار آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1930ء میں اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے حوالے سے مثبت نظریاتی عنصر کا اظہار کیا تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی برصغیر میں ایک خطہ سلطنت برطانیہ کے اندر یا اس سے باہر تخلیق کیا جائے۔ اس تجویز کا ٹھوس نتیجہ تقریباً وہی ہے جو اب پاکستان کے نام سے موسوم ہے لیکن اقبال اور دوسرے مسلم دانشور تسلی بخش طور پر اس کشاکش کو ختم نہ کر سکے جو اسلامی نقطہ نظر کی ہمہ گیری اور اس کو ایک واحد ثقافتی اکائی میں محدود کرنے کے درمیان موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو اپنے لیے قوم کی کوئی واضح اور معین تعریف (Definition) نہ مل پائی اور نہ کوئی ایسا صاف تصور جس سے پتہ چلے کہ یہ کس قسم کی ریاست بنے گی۔ نیز ترقی کی غرض سے کوئی ٹھوس یا مستحکم حکمت عملی بھی نہ اپنائی گئی۔ ہر چیز حتیٰ کہ حکومت کی بنیادی تنظیم بھی نئے سرے سے بنانی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ یہ مملکت جس کو اپنی تخلیق کے بعد ابتدائی چند سال کے عرصے میں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا کیسے قائم و دائم رہی! اس کا سہرا عوام کے سر ہے جنہوں نے اپنی قوت ارادی سے پاکستان کی بقا کے لیے تگ و دو کی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان کا وجود برقرار رہے اور دشمنوں کے ارادے خاک میں مل جائیں۔ عوام کی ابتدائی نیک ارادی قوت کے باوجود، تصوراتی خلجان اور قوم میں ایک مضبوط دانشمندانہ ثقافت کے فقدان نے قومی طور پر متحرک، ایثار پیشہ اور ایماندار لوگوں کو قابل عمل آئینی ڈھانچے اور اچھی حکومت سے محروم کر دیا۔

اس فکری پراگندگی کے نتیجہ میں بحث چھڑ گئی کہ پاکستان کس طرح کی ریاست ہوگی۔ آیا اسلامی ریاست، جیسا کہ قدامت پسندوں کا خیال ہے اور جن کی پشت پر غیر تعلیم یافتہ اور آسانی سے جوش میں آ جانے والے عوام ہیں یا ایک جدید ریاست جیسا کہ خصوصاً جناح اور عموماً دوسرے لیگی لیڈروں کا خیال تھا۔ جماعت اسلامی جو متوسط طبقے کی ایک چھوٹی لیکن انتہائی منظم سیاسی جماعت تھی اسنے بھی ریاست کو غیر اسلامی قرار دے دیا تھا اور اپنے ارکان کو سرکاری ملازمت

کرنے سے منع کر دیا تھا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ایک غلط ریاست کی ملازمت بھی گویا ایک برائی (یا طاغوت) کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ریاست خود کو ایک اسلامی ریاست قرار دینے کا اعلان کرے۔ اس ضمن میں انہوں نے خود ایک مہم کا آغاز کیا، منظم مظاہرے کیے اور اس مقصد کے لیے لاکھوں پوسٹ کارڈ چھپوا کر دستور ساز اسمبلی کو ارسال کیے۔ سید مودودی کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح اعلان کرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ گویا کوئی فرد اپنے مسلمان ہونے یا اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتا ہے اور پھر اس طرح کے اعلان کے بعد اپنے عقیدے کے مطابق پیش قدمی کرنی لازمی ہو جاتی ہے۔

اس وقت کسی نے اس دلیل کا جواز طلب نہ کیا بلکہ اس کو ایک بدیہی صداقت کے طور پر قبول کر لیا گیا حالانکہ اس کے تین حل طلب پہلو تھے۔ (الف) اعمال یا افعال ہمیشہ نیتوں یا ارادوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، (ب) ریاست گویا انسانی افراد کی مانند ہے، جو اسلام قبول کرنے کے لیے ایک اعترافی اعلان کرتی ہے اور یوں ریاست اور شہریوں کے تعلق کو قانونی حیثیت مل جاتی ہے۔ (ج) مدینہ میں رسول کریم ﷺ کے عہد میں جو ریاست قائم کی گئی تھی وہ اس طرح کی ایک اسلامی ریاست تھی جیسا کہ علما کا موجودہ طبقہ سمجھتا ہے۔ ان پہلوؤں پر اگر یہ مسلمہ طور پر غلط نہیں ہیں تو بھی خاصے غور و خوض کے بعد تشریح اور تصوراتی وضاحت کی ضرورت ہے۔ مذہبی لیڈروں کے ارادوں کو اگر شک کی نظر سے نہ بھی دیکھا جائے تو بھی یہ بات درست ہے کہ اپنے ذہنی افلاس اور بیسویں صدی کی ایک مملکت کے رموز کے بارے میں ناواقفیت سے وہ اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اسلام نے ایک ہزار سال پہلے زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام مسائل کا مکمل جواب دے دیا تھا جن میں اقتصادی، سیاسی اور قانونی ڈھانچے وغیرہ کے مسائل شامل ہیں لہٰذا وہ کسی نہ کسی شکل میں ایک ایسی مثالی ریاست کو دوبارہ وجود میں لا سکتے یں جیسا کہ ان کی دانست میں اسلام کے صدر اول میں موجود تھی۔

پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ مشرقی پاکستان کی نسبت مغربی پاکستان میں زیادہ مقبول تھا۔ وجوہ ظاہر ہیں۔ پاکستان کے مغربی بازو میں جاگیردارانہ اور قبائلی نظام کا غلبہ ہے جس میں وسیع و عریض زمینیں چند جاگیرداروں اور سرداروں کی ملکیت ہیں۔ کسی نہ کسی طرح اسلام کی وہ تشریح جو مغربی پاکستان کے مذہبی علما کرتے رہے اس معاشرتی ماحول کو سہارا دیتی ہے۔ وہ

سمجھتے ہیں کہ زمین کی ملکیت ان کا اسلامی حق ہے اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ان سے زمین چھینے۔ جماعت اسلامی کے سب سے بڑے لیڈر سید ابوالاعلیٰ مودودی نے 1950ء میں ایک کتاب ''مسئلہ ملکیت زمین''، لکھی جس میں کہا گیا تھا کہ قرآن اور سنت (اسلامی قانون اور مذہب کے دو بنیادی ماخذ) کے مطابق زمین کی ملکیت کا حق ناقابل تنسیخ ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں سوشلزم کی سوچ کو بڑھنے سے روکا جائے جو وہاں زور پکڑنے لگی تھی اور مغربی پاکستان کے متوسط طبقے میں سوشلزم کی مقبولیت اور لیبر یونین تحریک کا سدباب کیا جا سکے۔ اسلام بظاہر حکمران طبقے کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی مدد سے صورت حال بدستور اپنی پہلی حالت پر قائم رہتی تھی اور کسی بھی قسم کی اقتصادی یا اراضی سے متعلق اصلاحات کا کوئی مطالبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسلام پسند طبقے کو تو اس طرح کے اقدامات سے ہی مطمئن کیا جا سکتا تھا کہ دستور ساز اسمبلی نے ''قرارداد مقاصد'' کی منظوری دے دی، جمعہ کی ہفتہ وار چھٹی کا اعلان کر دیا اور مرزا غلام احمد کے ماننے والوں کو غیر مسلم قرار دے دیا وغیرہ۔ ان میں سے کوئی اقدام بھی ایسا نہیں جس سے جاگیردار طبقے کے سیاسی غلبہ اور سیادت میں فرق آتا یا پاکستان کے حقیقی اقتصادی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی۔

عقل و دانش کی سطح پر منظر نامہ آج بھی اتنا ہی انتشار کا شکار ہے جتنا کہ پاکستان کی تخلیق کے ابتدائی دور میں تھا بلکہ کچھ اور زیادہ ابتر حالات میں ہے۔ اس کا سبب ان تشدد پسند گروہوں کی موجودگی ہے جو اپنی ہر بات کو قوت کی دلیل سے منوانے کے عادی ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معاشرے کے تمام طبقے جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں یکساں ثقافت جس کی بنیاد عقل و دانش پر ہو قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے آج جہاں موجود ہے یہ علاقہ صدیوں سے غیر دانشورانہ یا غیر عقلی مزاج کا حامل رہا ہے۔ یہاں کے اکثر لوگوں کا میلان طبع زیادہ تر جذباتیت کی طرف مائل ہے ان کو جلدی بھڑکایا جا سکتا ہے اور ان کی ذہنی ساخت ایسی ہے کہ کوئی ایسی عقلی دلیل (مستقل طور پر) قبول نہیں کر سکتے جو دیر طلب اور سنجیدگی کی متقاضی ہو۔ بدقسمتی سے یہ باتیں صرف عوامی یا گروہی سطح تک ہی وقوع پذیر نہیں ہوتیں بلکہ اعلیٰ درجے کی علمی درسگاہوں، یونیورسٹی اسکالروں کے مذاکرات، مذہبی مباحث اور اخبارات و کتب کے تمام مراحل و مدارج میں بھی یہی کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔ یونیورسٹی کے شعبوں میں حقیقی اسکالر تاریخ، فلسفہ

عمرانیات، انسانیات اور اقتصادی علوم میں اپنی غیر حاضری کے ذریعے نمایاں ہیں۔ پاکستانی یونیورسٹیاں علوم انسانی اور معاشرتی علوم کے شعبوں میں بہ مشکل ہی کوئی تحقیقی کام پیش کر رہی ہیں جوان کے نام کے شایان شان ہو۔

مثبت (سائنسی) علوم میں بھی کوئی بہتر کارکردگی دکھائی نہیں دیتی بلکہ یہ شعبے محض تحقیق کے لگے بندھے ضابطوں کی خانہ پری کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ دانش ورانہ ثقافت نے یونیورسٹیوں میں اپنے قدم نہیں جمائے اور نظام تعلیم کو تجارتی بنیادوں پر چلانے کی وجہ سے جو تھوڑی بہت بے لوث دانش وری رہ گئی ہے وہ بھی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان شعبوں کو ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بات حکمران اشرافیہ طبقے پر بھی صادق آتی ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہوشمند دانشوروں کی وساطت سے ہی معاشرے میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ مسلمان دانشور عالم اسلام میں عموماً اور خاص طور پر پاکستان میں ہم عصر چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے؟ اسی بات کو بنیادی طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان دانشور انہی محدود دائروں کے اندر ہی کیوں رہتے ہیں جو انہوں نے اپنے لیے دسویں صدی عیسویں میں قائم کیے تھے؟ مسلمانوں کے مخصوص فکری اور عقلی کاوشوں کے لیے ایک ترقی پذیر فکری سانچہ کا تعین ایک مفید عمل ہو گا۔

مسلم معاشرہ ابھی اپنے ابتدائی دور میں ہی تھا کہ اس کو چند شدید صدمے برداشت کرنا پڑے جن میں سے پہلا صدمہ رسول اکرم ﷺ کی اچانک وفات کا سانحہ تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات کے مذہبی تقدس کے زیر اثر عام لوگوں کو غیر شعوری یا نیم شعوری یقین تھا کہ رسول اکرم ﷺ ان کے درمیان ہمیشہ رہیں گے۔ اس ماحول میں اصحاب رسول کو بالکل اعتبار نہ آتا تھا کہ آنحضرت اب ان کے درمیان نہیں ہیں۔ گویا اس خاموش عقیدے کا ثبوت تھا کہ وہ رسول کریم کے دائمی وجود کے قائل تھے۔ اس کے بعد آدھی صدی کے دوران میں لوگوں کو اندرونی چپقلش کا غم برداشت کرنا پڑا اور دو مرتبہ خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا جس میں وہ حسن اتفاق سے مکمل شکست وریخت سے محفوظ رہے۔

لگتا ہے کہ شکست وریخت کا خوف امت کے ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف طرح کے دفاعی طریقہ ہائے کار وضع کیے گئے مثلاً سب سے پہلے مسلم معاشرے نے خود کو ایک منضبط مرکز کے گرد منظم کیا جس سے بتدریج ملوکیت کا راستہ ہموار ہوا۔

حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت عرب معاشرہ آمرانہ اندز فکر کا حامل نہ تھا بلکہ بہت زیادہ انفرادیت کی طرف مائل تھا۔اس طرح لوگوں نے اپنی رضا سے فرماں برداری پر مبنی ایک دینیاتی نظام اپنالیا اور اسی کو ترقی دی۔اس دینیات کے مطابق بدائی حاکم خدا ہے جو قادر مطلق ہے اور دنیا سے ماورا ہے جبکہ ثانوی حاکم وہ ہے جو سیاسی طاقت کا مالک اور بااختیار ہے (اولوالامر منکم)۔اس قسم کی صورت حال کو اس دینیاتی ڈھانچے سے مابعدالطبعیاتی تائید ملتی ہے جو قدر کو رضائے الٰہی پر مبنی قرار دیتی ہے۔کوئی چیز اس لیے اچھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یہی ہے کہ وہ اچھی ہو ورنہ کسی بھی چیز میں اصلی اور حقیقی قدر موجود نہیں ہے۔جب یہی دینیاتی نظام قانون سازی پر لاگو کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ابدی ودائمی قانون ساز بن جاتا ہے اور اس طرح جو بھی قانون یا قانونی ضابطہ بنتا ہے اس کو کبھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ اس انداز سے گویا کوئی بھی قانون سماجی بہبود کے لیے نہیں بنایا جاتا بلکہ سماجی بہبود اس قانون کا نتیجہ قرار پاتی ہے کسی بھی طرح کی قانون سازی اگر سماجی بہبود کے فروغ میں ناکام رہتی ہے تو اس میں خود اس قانون کی کوئی کوتاہی نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کے ارادوں میں نقص ہوتا ہے جو اس کو نافذ کرتے ہیں۔اس قسم کا مغالطہ جو عموماً دینیاتی دلائل کو متاثر کرتا ہے،منبر اور جامعات دونوں سطحوں سے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اس دانشورانہ پیراڈیم کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ قانون اخلاقی یا معاشرتی اقدار کے حوالہ سے جامد اور نخوت پسند بن جاتا ہے اگر کوئی قانون کا تنقیدی جائزہ لینے کی جسارت کرتا ہے تو اس کو معاشرتی مقاطعہ یا دیگر ہولناک نتائج کی دھمکیاں ملتی ہیں۔

مسلمانوں کی اس دانشورانہ تاریخ نے متعدد متبادل فکری مثالیے (پیراڈائم) پیش کیے جن میں کم از کم تین اقسام زیادہ قابل ذکر ہیں عقلی،صوفیانہ اور کلامی اس کے باوجود معاشرے نے آخری قسم کا انتخاب کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔عقلیت پسندی احساس ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے اور بنی نوع انسان کا میلان طبع اس سے اجتناب کرنے کی طرف مائل ہے۔انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ احکام کو ماننے اور اقتدار کے اتباع میں سہولت اور آسانی پاتے ہیں۔انسانوں کے حکم ماننے کے لیے قدرتی رجحان۔کے علاوہ اس دور کی سماجی اور سیاسی صورت احوال بھی حاکمانہ نمونے کی متقاضی تھی۔یہی وہ وقت تھا جب دینیات کا نظام کوئی واضح شکل اختیار کررہا تھا۔یہ

بات عوام کے علاوہ ماہرین قانون کے لیے بھی قابل تسلیم تھی۔ قانون سازی کا یہ نمونہ مسلمانوں کے ذہن میں اس حد تک راسخ ہو چکا ہے کہ اب یہ ایک بدیہی صداقت نظر آتا ہے اور فطری طور پر ہر پہلو سے مذہب کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات کہ یہ مذہب کی ایک تعبیر ہے اور ان بہت سی دینیاتی اور مابعد الطبعیاتی ساختوں میں سے ایک ہے نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز مسلمانون کے ذہن کی طبعیت ثانیہ بن گیا اور اس کو کوئی نہ مانے یا اس پر نکتہ چینی کی جائے تو گیا اس کے مذہبی وجود کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک شخص انتہائی طور پر مذہبی ہوسکتا ہے لیکن کسی مخصوص دینیاتی اور مابعد الطبعیاتی ساخت سے انکاری ہے جمع ضدین سمجھی جاتی ہے اور ایسے شخص کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

جنوبی ایشیا کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں اسلام پہلے تو ساحلی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی بستیوں کی شکل میں متعارف ہوا اور پھر بعد میں ایک سلطنت کی صورت میں ایک مضبوط تہذیب کے بالمقابل وجود میں آیا۔ یہ مخالف تہذیب ہندوستانی تھی جس کی جڑیں ہندومت کے ثقافتی ورثے میں پیوستہ ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں یعنی اسلام اور ہندومت ایک دوسرے کے آمنے سامنے موجود رہیں اور ان میں سے کوئی نہ تو اتنی جاذب اور لچکدار تھی کہ دوسری اس کو اپنے اندر سمو لے اور نہ اتنی طاقتور تھی کہ دوسری کو نیست و نابود کر دے۔ البتہ انہوں نے کچھ رسموں رواجوں یا سماجی اور ثقافتی طرز عمل کی حد تک ایک دوسرے کو جزواً متاثر بھی کیا۔ مسلمانوں نے حمیت کے جذبے سے اپنے توحید پرستانہ تشخص کی حفاظت کی جبکہ ہندو ہمیشہ غیر ملکی مسلمانوں کی حکمرانی سے چوکنے رہے۔ اس طرح کے معاملات میں یہ ایک فطری بات تھی کہ ہندوستان میں مسلم معاشرہ اپنے آپ کو غیر محفوظ اور مخدوش حالت میں محسوس کرتا تھا۔ لہٰذا قانون کے الفاظ کو اہمیت دیتے ہوئے اور مذہب کے باطنی مفہوم کے بجائے اس کے رسمی اظہار پر زور دیا گیا۔ سید احمد سرہندی (1564ء تا 1624ء) یا شاہ ولی اللہ (1703ء تا1762ء) کی اصلاحی تحریکیں ایک لحاظ سے مسلمہ امہ کے اجتماعی خدشے کے خلاف اپنے تہذیبی تحفظ کی کوششیں تھیں۔ جب تحریک پاکستان کے لیے مذہبی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو علما نے اس کو فراہم کیا اور مذہب کی اس قانونی اور رسمی دسترس کے ساتھ اس کی حمایت کی جس کو برصغیر کے مسلمانوں میں سے متوسط شہری طبقے اور تجارت پیشہ بورژوا کی تائید بھی حاصل تھی۔ ایک بار تخلیق پاکستان کے ساتھ اسلام کا رشتہ جڑ گیا تو پھر سیاسی

رہنماؤں نے اس بات کو نہ سوچا کہ ایک جدید مسلم ریاست کی ترقی کے لیے آئندہ اس سے کیا مسائل پیدا ہوں گے!

یہ ہے تخلیق پاکستان کا وہ عمومی تناظر یا پس منظر جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان دانش ور مندرجہ ذیل پہلوؤں پر پوری طرح سے غور و فکر کرنے سے قاصر رہے:

(ا) ہندوستان میں مسلم قوم پرستی ایک مخالفانہ عامل یعنی ہندو یا بھارتی قوم پرستی کا طفیلی/ضمنی عنصر ہے۔

(ب) دین اسلام کی بنیاد پر کسی ریاست کے لیے مطالبہ اسلام کے بین الاقوامی اور عالمگیریت کے پہلو سے با آسانی اور پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔

(ج) مطالبہ پاکستان کی محدود حمایت برصغیر کے زیادہ تر شہری اصلاحی اسلام کی طرف سے ہوئی۔

(د) یہ اسلام ایک مخصوص دینیاتی نظام کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں خدا پوری طرح دنیا سے الگ تھلگ اور ماورا ہے۔

(ہ) ان پڑھ عامۃ الناس ایک ایسے شاندار ماضی کے تصور کے لیے متحرک کیے گئے جو رومانی انداز کا تھا اور سادہ دلی سے تسلیم کرلیا گیا۔

یہ فکری نقشہ یا تصوراتی دائرہ کار ایک ایسی جدید ریاست کی تخلیق میں مسائل کا باعث ہوا جس کی بنیاد اسلامی قدروں پر ہو جیسا کہ مسٹر جناح نے سوچا تھا۔ یہاں، ہم نے یہ مفروضہ تسلیم نہیں کیا کہ تاریخ ہمیشہ ایک سرد منطق کی راہ اختیار کرتی ہے یا یہ کہ ہندوستان کی تقسیم سے پہلوتہی کی جاسکتی تھی۔ ہندوستان تو شاید کبھی مشکل سے ہی ایک متحدہ سلطنت کے طور پر قائم رہا ہوگا اور اس موجودہ صورتحال میں تو یہ متعدد اکائیوں میں تقسیم ہوسکتا ہوگا لیکن ایک طویل تعلیمی پس منظر، زیادہ دانشمندانہ قوت اور اپنا کردار ادا کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنے پر مسلم قیادت حالات کے دھارے کو زیادہ مثبت انداز سے متاثر کرنے کے علاوہ آزاد یا خودمختار مسلم ریاست یا ریاستوں کی حکمرانی کے لیے ایک بہتر انداز سے سوچا سمجھا منصوبہ زیر عمل لاسکتی تھی جس نے جلد یا بدیر معرض وجود میں آنا تھا لیکن عقلیت پسندی پر تعمیر کردہ ایک آزاد جمہوری جزیرہ نمائے ہندوستان کا دوسری عالمگیر جنگ سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں وجود میں آنا دشوار تھا۔ اس کے باوجود آج کے لیے ایک بہتر تفہیم اور ہم عصر

صورت حال کے تجزیے سے مستقبل میں پیش آنے والے حالات کو متشکل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ پاکستان جیسا کہ ایک جغرافیائی اکائی کے طور پر تقریباً اقبال کے تصور کے مطابق ہے اور ان سماجی وسیاسی اور مذہبی حدود میں واقع ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں سے کہاں تک ترقی کی گنجائش ہے؟ آیا اس صورت حال کے تصوراتی تجزیے سے اس سلسلے میں ہماری مدد ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے ملک کی آئندہ ترقی کے لیے مناسب راہ عمل اختیار کرلیں؟

آیئے ہم پہلے ہی یہ اعتراف کیے لیتے ہیں کہ مذہب نے چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو پاکستانی لوگوں کی زندگی میں واقعی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کو ان کی زندگیوں سے خارج کرنے کی کوشش ایک غیر دانشمندانہ عمل ہوگا اور محض ناکامی اس کا مقدر ہوگی۔ مذہب اپنی تمام ناکامیوں اور بیجا استعمال کے باوجود ایک بیحد اہم قومی اور معقول ماورائی حوالہ ہے جو بےلوث اقدار کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس ماورائی حوالے کے بغیر انسان انانیت یا زیادہ سے زیادہ افادیت کا شکار ہونے کا میلان رکھتے ہیں۔ یہ متحرک کرنے والی سب سے مضبوط طاقت بھی ہے جو لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مفادات کو قربان کرکے نیک عمل کرنے پر آمادہ کرسکتی ہے اور پھر یہ بھی درست ہے کہ اسلام میں دنیاوی اور مقدس کی تصوراتی تقسیم کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام صرف ہمہ گیر تقدیس کی درجہ بندی کے تحت عمل کرتا ہے اور اس میں صرف نیکی اور بدی یا اچھے اور برے کی تمیز کی جاسکتی ہے۔ ایک لحاظ سے اسلام نام نہاد دنیاوی افعال کو اس بنا پر تقدیس عطا کرتا ہے کہ اس میں ان کی نیک نیتی شامل ہوتی ہے اور جن کو مشترکہ طور پر ایک نیکی ہی سمجھا جاتا ہے اور ایک معنی میں ان انسانی افعال کو بےتقدیس قرار دیتا ہے جن کو عام حالات میں اکثر خالص مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ تمام مذہبی رسم ورواج کا مقصد سماجی بہبود کا حصول ہی بتایا جاتا ہے تاکہ انسانی زندگی کے معیار کو بہتر کیا جاسکے اور معاشرے کی فلاح کی صورت گری ہو۔ مذہب ایک ہمہ گیر شعور کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے جس سے افعال خارجی یا داخلی حکم کے بجائے کسی نتیجے کے طور پر حسب ضرورت سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دنیاوی امور پہلے سے ہی مقدس زمرہ میں شامل ہوجاتے ہیں اور اسی طرح مقدس اور غیر مقدس، یا دینی اور لادینی کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ انسانی اعمال ان دونوں زمروں سے ماورا ہوکر غیر جانبدار بن جاتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ اسلام لادینیت کے ضمن میں اتنا مزاحم ہے جبکہ دوسرے بڑے مذاہب یعنی عیسائیت، ہندومت اور

کنفیوشس کا مذہب کم وبیش کسی نہ کسی حد تک لادینیت کو قبول کر چکے ہیں۔ اسلام کے جدید عذر خواہوں کا قصور یہ ہے کہ وہ سیکولر اور مقدس کی ثنویت کو پوری طرح سے تسلیم کرتے ہیں اور پھر دونوں زمروں کو حکم اور فرماں برداری پر مبنی دینیاتی ساخت کے تحت یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دائرہ فکر میں دونوں کے درمیان جو تناؤ موجود ہے وہ کبھی تحلیل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ایک ہی زمرے (یعنی روحانی) سے آغاز کیا جائے اور بعد میں ایک ہمہ گیر مذہبی شعور کے تحت اسی کے افعال کے فرق کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس طرح ایک عمل کا استناد اور اعتبار اس حقیقت سے اخذ کیا جائے گا کہ یہ بعض قوانین کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ یہ خود ایک معتبر ماخذ سے ماخوذ ہے اور اپنے قوانین استناد خود تخلیق کر سکتا ہے۔

بظاہر یہ دور کی کوڑی لانے والی بات ہے لیکن اگر مذہب کو سمجھنے کا پیراڈائم بدلے گا تو جنوبی ایشیا کے مسلم دانشوروں کے ذریعے ہی مہیا ہوگا۔ اس قیاس آرائی کے کچھ دلائل موجود ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(1) مسلمان ملکوں میں سے وہ جو نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور جن کی نظریں مستقبل کی جانب ہیں وہی ہیں جنہوں نے دو متبادل دائرہ ہائے فکر میں سے ایک کو اختیار کر لیا ہے یعنی سیکولر یا مقدس۔ ترکیہ نے سیکولر طرز کو اختیار کر رکھا ہے اور اس کو ریاستی طاقت کے ذریعے ایک نظریہ حیات کی طرح بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی تصورات عام لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں ان دونوں فریقوں میں جو چپقلش پائی جاتی ہے وہ ریاست کے جواز اور مقاصد کی کسی بھی عقلی طور پر تسلیم شدہ نمونے کے لیے غیر تعمیری ہوگی جب تک کسی جائز اور مناسب پیراڈائم کو فروغ نہ حاصل ہو جائے جو مذہبی شعور میں اعتدال لائے اور جدید ریاست کے عمل اور ترقی کی ضروریات کو پورا کرے اس وقت تک معاشرے کے لیے ایک مکمل باتدبیر اور مضبوط معاشرتی عمل کو بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ ایک دوسرے ملک ایران نے امام کے تصور کے ذریعے جو فی الوقت غیاب میں ہے الوہی حاکمیت (حکومت الٰہیہ) کے تصور کو قبول کر لیا ہے۔ اس عبوری دور میں الٰہیاتی فقیہ (یا ولایت فقیہ) الٰہیاتی عزائم کی توجیہ اور تاویل کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تصور عوام کی خواہشات کے بہت قریب ہے لیکن کسی چرچ کی الٰہیات کے مانند

اس میں بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے۔ معاشرے کے بنیادی تضادات گومگو کی حالت میں حل طلب رہیں گے۔ ان متبادل صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا عمل ایسا ہے گویا کہ ایک مخمصے کو اپنے اوپر لادلیا جائے اس سے پیدا ہونے والی الجھنوں کا مسلم عوام کو بہرحال سامنا کرنا ہوگا تاوقتیکہ وہ اس کو ایک نئے تصوراتی تناظر میں حل نہ کرلیں۔

(2) قدامت پسندانہ مذہبی نظریہ کے استحکام اور ایک دروں بین اجتماعی نفسیات کے باوجود ہندوستان وہ سرزمین تھی جہاں مذہب کو برقرار رکھتے ہوئے سید احمد خان (1817ء تا 1898ء) نے مذہب کی تفہیم اور اس کی تاویل کے لیے ایک نئے تنقیدی طریق کار کو فروغ دیا۔ سید احمد خاں نے مسلم دنیا کے دوسرے خطوں کے اپنے پیش روعلما سے کہیں زیادہ آگے جاکر مسلم دانش وری کے اس مہلک سکوت کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی جو گزشتہ پانچ سوسال سے موجود تھا۔ انہوں نے مسلم دینیات کے متبادل تعمیری طریق کو ترقی دینے کا سلسلہ اس لیے شروع کیا کہ وہ مذہب کی افہام و تفہیم سائنسی نظریے کی مدد سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ قدامت پسندانہ اسلام کی جانب سے سخت مخالفت کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے لیے گویا ایک دریچہ کھل گیا جس سے معلوم ہوا کہ مغربی دنیا میں کیا ہورہا ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر تھا جو برصغیر میں مسلم دانشوری کی تاریخ میں ایک منفرد واقعہ تھا۔ اس سے پیشتر مغلیہ عہد کے دوران جبکہ ان کو پرتگیزی اور برطانوی نوواردوں سے واسطہ پڑا اس وقت بھی کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا تھا کہ ان سے کچھ سیکھا جائے یا کوئی فائدہ اٹھایا جائے حالانکہ وہ لوگ ہندوستان میں جدید علم اور ٹیکنالوجی کے نئے راستے بنارہے تھے۔ بعد میں اقبال کی شخصیت میں ایک اور استثنائی صورت سامنے آئی جس نے مغربی روایت میں تعلیم حاصل کی تھی اور جس نے اپنے مدراس میں دیئے گئے لیکچرز کو ''Reconstruction of Religious Thought in Islam'' (یعنی اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو) کا عنوان دیا تھا۔ جس میں اسلامی فکر کی نئ تشکیل کے ایسے امکان پر توجہ مبذول کرائی گئی جو قدامات پسند ہندوستانی مسلم دانش وری کے نقطہ نظر کے لیے بھی قابلِ قبول ہو۔ اگرچہ اقبال نے اپنے فکار کے مفہوم کو بڑی احتیاط سے لفظوں کی صورت میں ڈھالا ہے اور اجتہاد کے تصور کو اس کے پورے مفہوم میں پیش کرنے کی

جسارت نہیں کی تاہم انہوں نے اسی مفہوم کے لیے ''اسلام میں حرکت یا عمل کے اصول'' کی اصطلاح استعمال کی ہے جو کہ بڑی حد تک واضح ہے۔ان کے فلسفے کے پورے تناظر کو دیکھا جائے تو اسلام کی روح ایک طرح سے متواتر تخلیقی عمل کی حیثیت رکھتی ہے اور اپنے آپ کو ایسی نئی صورتوں میں ظاہر کرنے کے لیے آزاد ہے جو ضروری نہیں کہ پہلی صورتوں سے مشابہ ہوں۔اقبال کے سوا کسی اور نے اس انداز سے اسلام کی نئی تاویلات کی راہ کھولنے کی کوشش نہیں کی جو غیر روایتی علم کلام اور ارسطا طالیسی منطق پر مبنی نہ ہو۔یہ دونوں کوششیں (سرسید اور اقبال) ایک نئے دائرہ فکر کو پروان چڑھانے کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور دونوں کا اصل ماخذ بھی جنوبی ایشیا میں ہے۔

(3) پاکستان میں (اگرچہ بعض اور مسلم ممالک میں بھی) ایک اہم معاشرتی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ہے یعنی دیہی آبادی کی شہروں کی طرف منتقلی۔علاوہ ازیں ذرائع ابلاغ کا انقلاب دیہی آبادی پر بڑے نمایاں طور پر اور بہت تیز رفتاری سے اثر انداز ہو رہا ہے۔اس نقل مکانی کے دو بڑے نتائج وجود میں آتے ہیں۔پہلا تو یہ ہے کہ آبادی کے بہت بڑے حصہ پر جاگیردارانہ گرفت اب کم ہو رہی ہے۔وہ دیہاتی جو اپنے گھر بار چھوڑ کر شہروں میں جا بسے یا انہوں نے شہری زندگی کے جدید طور طریقے اختیار کر لیے،اب وہ ان جاگیردار آقاؤں کے پہلے کی طرح مستقل ووٹر نہیں رہے جو ان کو پارلیمنٹ یا اسمبلیوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ تھے۔یہ بات پاکستان کی اسمبلیوں کے یکے بعد دیگر انتخابات کے انعقاد سے سامنے آئی ہے اور مزید بیس ایک سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ہی ملک کے حکمران طبقے میں واضح حد تک معیاری تبدیلی دیکھنے میں آئے گی۔دوسرا اور بہت نمایاں نتیجہ یہ ہوا کہ شہری آبادی میں بڑھتے ہوئے اضافے،سیاسی لحاظ سے مرکز کے اختیارات میں اضافہ،منڈیوں کی اقتصادی حالت اور مزدوروں کی نقل مکانی جیسے عوامل نے مل کر بقول گیلنر (Gilner) عوامی اسلام کی معاشرتی بنیادوں کو کمزور کر کے عوام الناس کو بلند تر اسلام یا اصلاح شدہ اسلام سے متعارف کیا ہے۔اصلاح شدہ اسلام سے ایک اصلی یا حقیقی مشترک تشخص اور مسلم آبادیوں کی معاشرتی عظمت کو ایک قسم کی سند ملتی ہے اور وہ ان کو دیہی یا عوامی طبقہ سے اوپر اٹھا کر نیا وجود بخشتا ہے اور مثبت طور پر خود آشنا کرتا ہے۔نیز یہ منتقلی مدنی

قدروں کو مضبوط کرتی ہے اور جاگیردارانہ ثقافت کے خلاف مزاحمانہ قوت مہیا کرتی ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ تمام قابل ذکر سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں نے جاگیرداری کو قابل مذمت قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جاگیرداروں کا وسیع و عریض اراضی پہ قابض رہنا ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ جماعت اسلامی کے نئے امیر اپنے پیش رو رہنماؤں کے علی الرغم اب جاگیرداریت کو ایک معاشرتی خرابی خیال کرتے ہیں اور ڈاکٹر اسرار احمد اس نکتے کی وکالت کرتے ہیں کہ پاکستان میں زمینیں عشری نہیں ہیں۔ (یعنی وہ اراضی جو کسی فرد واحد کی ملکیت ہو اور وہ اس کا ٹیکس حکومت کو ادا کرنا ہو) بلکہ یہ خراجی ہیں (یعنی وہ اراضی جو فتوحات سے حاصل ہوں اور ریاست ان کی مالک ہو)۔ جماعت اسلامی کے کتابی اثاثے میں ان کے ایک سابق امیر کی ملکیت اراضی پر لکھی ہوئی کتاب اب شاید ہی اشاعت پذیر ہو۔

(4) تجدید اور اصلاح سے گزرنے کے بعد اسلام کا مدنیت پر مبنی اسلام کا تصور صرف شہروں میں موجود ہے۔ شہری اسلام جزوی طور پر نوآبادکاری کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور جزواً اپنی طبعزاد فطرت کی بدولت مغربی نظریات اور فلسفوں سے بدظن ہونے کے علاوہ مدافعانہ اور مناظرانہ مزاج کا حامل ہے۔ یہ اب بھی اپنے اندر اس حد تک خود کفالت رکھتا ہے جو گویا ایک نظام کے طور پر قابل عمل ہے اور حکمرانی کی ناکامیوں اور ترقی میں کمی کا افراد یا بین الاقوامی سازشوں کو موردالزام ٹھہراتا ہے۔ چونکہ اکثر مسلم ممالک میں مدنی اسلام کی گرفت عوام الناس پر ہمہ گیر نہیں ہوتی اس لیے ان کے لیے اپنی کوتاہیوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ جنرل ضیا الحق کو جنہیں عموماً مسلم اصلاح پسندوں کی حمایت حاصل تھی ایک معمول کی منتخب شدہ اسمبلی کی نسبت زیادہ قدرت و اقتدار حاصل تھا اور جن کا ارادہ تھا کہ پاکستان میں اسلام کی حکمرانی قائم کی جائے ان کو بعد میں اسلام پسندوں کی شدید نکتہ چینی کا اس لیے تختۂ مشق بننا پڑا تھا کہ سماجی اور انفرادی اقدار کی قابل فہم اور نمایاں بہتری کی طرف پیش قدمی کے بجائے عوام کی اخلاقی حالت اور بھی ابتر ہوگئی، نیز سیاسی کلچر بھی زبوں حالی کا شکار ہوگیا۔ الجزائر جیسے ملکوں میں اصلاح شدہ اسلام کو سیاسی لحاظ سے اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت نہ دی گئی، لہٰذا اس کو ایک مسلم

ملک میں حکمرانی کی ناکامی کے لیے دوسروں کو موردالزام ٹھہرانے کے لیے ایک جواز فراہم ہوگیا۔

(5) شہری اسلام میں وسیع درجہ بندی کی گنجائش ہے۔ ان میں انتہائی قدامت پسند، خالص اصول پرست، جامد تقلید کے حامی اور رسمیات کے علمبردار ہیں جن کو نظریاتی حجت کا ایک نظام مہیا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس طرح کے عوام کا آبادی میں بنیادی طور پر کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ پاکستان میں اس کا تناسب فی الوقت دو سے تین فیصد کی شرح تک ہے۔ اس کے برعکس شہری اسلام عوامی اسلام کی حدوں کو چھونے لگا ہے جہاں ایک صوفی یا ملا رسم ورواج کے حوالے سے معمول کے کاموں میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن کسی فرد کی پوری زندگی کو عوامی اسلام کی طرح پورے طور پر اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتا۔ فرد سے یہاں ایسا شخص مراد ہے جو کسی مقصد یا اصول یا صاحب اختیار کی خاطر کسی گروہ کو نسلی، سیاسی اور اقتصادی عوامل کے ذریعے اپنے زیر اثر رکھ سکے۔ اگر اور کوئی فرق و امتیاز نہ ہو تو یہ ایک سبب ہے کہ وہ لوگ ان اشخاص کو ووٹ دیتے ہیں جن کو وہ زیادہ مذہبی سمجھتے ہیں۔ تاہم مذہب کی طرف جھکاؤ ان کے طرز عمل کا کوئی واحد عنصر نہیں ہوتا۔

(6) نام نہاد شہری اسلام کو ابھی اس امر کا احساس کرنا ہے کہ ان کے پاس اسلامی نظریہ حیات کے خاکہ نما عمومی ڈھانچے کے لیے کوئی مثبت مواد نہیں ہے۔ ان کو بنیادی قسم کی مشکلات کا سامنا ہے جن کی بنا پر وہ مندرجہ ذیل امور کی واضح طور پر تعریف (Define) نہیں کر سکتے:

(الف) قانون کی نوعیت

(ب) انسانی حقوق

(ج) سیاسی ڈھانچہ

(د) عدالتی امور یا انصاف کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کا مقتدر کے طور پر کردار

(ہ) کسی مسلم ریاست میں عامۃ الناس کی معاشی سرگرمی کے مقاصد اور عزائم کے بارے میں اقتصادی ایجنڈا جو غیر مبہم انداز سے پیش کیا جائے اور

(و) اس بات کا واضح تر تصور کہ دین اسلام اور مسلم دینیات میں کیا کچھ مستقل ہے اور کیا قابل ارتقا ہے۔

ان کی فکری ساخت کا جمود یا بانجھ پن صرف اسی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے جب خود ان کو یا ان جیسے لوگوں کو کسی ملک کی حکمرانی کا موقع ملے۔ ان کی ناکامی کی وجہ سے ناقدانہ تحقیق کا موقع پیدا ہوسکتا ہے جس کا تعلق خالص عقیدے یا اصلاح شدہ اسلام سے ہو خواہ اس کے نتیجے میں انسانی طرز عمل متفرق ہوکر سیکولر اور مقدس صورت اختیار کرلے یا پھر ایک زیادہ ہوشمندانہ ادراکی جدوجہد ہو تاکہ ایک مواحدانہ پیراڈائم کے لیے ارتقا کی صورت پیدا ہوجائے جہاں خدا آ گاہی ایک تصور یا ایک حوالہ جاتی نکتے کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا ہے اور نئی ساخت کی ترقی کے لیے ایک تخلیقی عمل کا باعث بنتا ہے۔ اول الذکر معاملے یعنی مقدس اور سیکولر کی تقسیم کی صورت میں دونوں متقابل گروہ ایک متواتر کشمکش میں ہوں گے، مقدس زیادہ سے زیادہ تنگ نظری اور بنیاد پرستی پر اصرار کرے گا اور سیکولرز زیادہ سے زیادہ آزاد منش معاشرے اور نرم اخلاقیات پر زور دے گا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان میں معاشرتی حرکیات لازماً فکری دائرہ عمل کو اس انداز سے بدلے گی کہ تنگ نظری پر مبنی بنیاد پرستی ایک نئے ترکیبی مجموعے کی شکل اختیار کرلے گی اور اس میں کامیابی اس وقت ہوگی جب دین اسلام کو سیکولر بنائے بغیر دینیات کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے گا۔ اسلامی دانش وری کی ایک اسی نوعیت کی تاریخی روایت بھی موجود ہے (یعنی عقلیت پرست) اگرچہ اس کو برتری حاصل نہیں ہے۔ اسلامی قانون (شریعت) اور عقائد کی ترقی میں استخراجی منطق کے غیر معمولی اثر ورسوخ نے ماضی میں متبادل دینیاتی نظاموں کے پنپنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ سیاسی اور معاشرتی نظام جس کا رجحان حکومت کی آمرانہ صورتوں کی طرف ہے جو حکومت کی مختلف شکلوں کے تنقیدی جائزوں کے لیے موزوں نہ تھا۔ مسلمان سیاسی نظریہ ساز اور دانش ور اچھے حکمرانوں کی خوبیوں کے بیان پر ہی مطمئن ہوتے تھے یا زیادہ سے زیادہ ان کو مشورہ دیتے تھے کہ اچھی حکومت کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ بات کہ عوام ایک برے حکمران کو معزول کرنے یا عوامی رائے دہندگی کے ذریعے ایک نیا حکمران منتخب کرنے کا حق رکھتے ہیں اس تصور کو اسلام کے سیاسی فلسفے میں کوئی مقام حاصل نہ ہوسکا۔ اختلاف رائے کا حق تو دیا گیا لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسی شرائط بھی عائد کردی گئیں جن سے اس تصور کی حوصلہ افزائی کے بجائے اس کو کالعدم کرنے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ محض بیسویں صدی کی بات ہے اور وہ بھی جدید مغربی افکار کے اثرات کے نتیجہ میں کہ اسلام کے سیاسی افکار کی زبان میں تبدیلی رونما ہوئی اور اس میں انسانی

حقوق، آزادی اظہاراور حق رائے دہی جیسے تصورات کی بات ہونے لگی۔ منظم سیاسی پارٹیوں کے وجود کا حق اور سماجی بہبود پر مبنی ریاست کی ترقی جیسے عمومی تصورات کو اب اسلام سے متضاد نہیں گردانا جاتا۔

ہم عصر مغربی اور سیکولر دنیا اس تبدیلی کو سیاسی اسلام کے تصور کا ظہور سمجھتی ہے اور ان کی دانست میں تصادم تہذیبوں کے مابین وقوع پذیر ہوگا اور میدان میں فوری طور پر موجود متقابل قوت جو مغربی تہذیب کے خلاف ہے وہ اسلام ہے یہ دوری تبدیلیوں کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی ہے جو اسلامی دنیا میں بالکل ابتدا ہی سے پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اسلام پر بیسویں صدی کے جو اثرات پڑے ہیں ان سے وہ معاشرہ کھل گیا ہے جو گزشتہ ہزار سال سے دروں بینی کے باعث بند ہوکر رہ گیا تھا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل نو کے لیے جو بھی قدم اٹھایا گیا اس کے ردعمل میں رجعت قہقہری کا سامنا کرنا پڑا۔

ہم عصر شہری اسلام کی تعبیر وتشریح میں جو زبان استعمال ہوتی ہے اس کو محض غیر روحانی غیر اساطیری اور بیشتر سیکولر اور نظریاتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ بار بار دہرایا جانے والا فقرہ، جو ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے پہلی مرتبہ جنوبی ایشیا میں مقبول ہوا اور پھر مشرق وسطیٰ میں بھی پھیل گیا وہ یہ ہے ''اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ نظام حیات ہے۔'' پاکستان میں جو کہ ایک مسلمہ اسلامی ریاست ہے مذہبی جماعتوں کا مطالبہ یہ رہا ہے کہ اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو متعارف کرایا جائے چاہے اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ مذہب کی نوعیت اور کسی نظریہ حیات کے درمیان جو صریح تضاد پایا جاتا ہے وہ نمایاں نہیں ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ مذاہب اپنی اصل کے لحاظ سے ارادے پر مبنی ہیں جبکہ نظریہ حیات کا تعلق عقلیت اور بیانیہ سے ہے اور یہ درست یا غلط ہو سکتے ہیں۔ اب مذہب کے اس تبدیل شدہ تصور کے لیے ضروری ہے کہ خود اس کو اپنی کوتاہیوں کا کھوج لگانے دیا جائے اور بالآخر یہ سیکولر بنے بغیر ایک لحاظ سے ''غیر مذہبی'' قسم کا مذہبی بن سکے۔ تب مذہب کا زمرہ فالتو ہو جائے گا۔ تاہم خدا آگاہی کا وصف اب بھی معاشرتی اور انفرادی اخلاقی طرز عمل کو حدود میں رکھنے کا کام انجام دے سکتا ہے۔ جب تک اسلام بطور نظریہ حیات کے مفروضے کی آزمائش نہیں ہوتی اور اس کی عملی صداقت ظاہر نہیں ہوتی۔ ایک بظاہر حتمی صداقت کی حیثیت سے اس کا اثر ورسوخ کم نہیں ہوگا۔ یہ بات لازماً دکھائی دینی چاہیے کہ مذہب کی نظریاتی تشکیلات جیسی

کہ وہ فی الوقت ہیں معاشرے میں کوئی اچھی تبدیلی لانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ورنہ پرانے ڈھانچہ کی تخریب اور نئے سرے سے تعمیر نو کی ضرورت محسوس نہیں کی جائے گی۔

پاکستان، جہاں جناح اور اقبال، دونوں ہی بڑے محترم مانے جاتے ہیں اور جہاں دونوں نے دینی قیادت کا کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا میرے نزدیک ایک نئے پیراڈائم کے ارتقا کے لیے موزوں جگہ نظر آتی ہے جس میں مذہبی اور سیکولر دونوں زمروں کو زیرِ غور لایا جائے لیکن اس تفہیم کو عامۃ الناس تک پہنچائے جانے کی ضرورت ہے اور وہ بھی مقامی ذرائع ابلاغ کے ذریعے تاکہ وہ اس کو بخوبی سمجھ سکیں۔ فی الوقت جدید اور روایتی کے مابین ابلاغ کی شدید کمی ہے اور زبان نے ان دونوں کو جدا کر رکھا ہے۔ وہ دینی مباحث جو اردو یعنی پاکستان کی قومی زبان میں تحریر کردہ ہوں بڑی حد تک یک رخے ہوتے ہیں جبکہ وہ لوگ جن کی رسائی انگریزی زبان تک ہوتی ہے وہاں مختلف منطق کے ساتھ ساتھ وسیع تناظر میں مباحث پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سطح کی تبدیلی صرف اس صورت میں وقوع پزیر ہوتی ہے جب ہم کسی وسیع علمی مباحث میں حصہ لیتے ہیں اور یہ ان کے لیے اب دستیاب نہیں ہے جو صرف اردو خواں ہیں۔ پاکستان کا مستقبل اس بات میں مضمر ہے کہ ایک نئے فکری سانچہ کے نمونے (paradigm) کو شہر کے خواندہ لوگوں کے لیے انہی کی زبان میں پروان چڑھایا جائے۔ یعنی ایسے مباحث اردو زبان میں فراہم کرنے کا اہتمام ہو۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصور ثقافت

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کسی قوم یا ملک کی ثقافت دراصل ملک وقوم کے اجتماعی ذہنی رویوں اور روحانی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس کی تشکیل میں منفرد سماجی وسیاسی اور اقتصادی و مذہبی عناصر معاون ہوتے ہیں اوران کی نمود عموماً فنون لطیفہ یعنی، مصوری، موسیقی، فن تعمیر اور شعر وادب کے وسیلوں سے ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ ان سارے عناصر اور وسیلوں کو متحرک اور فعال بنانے والوں میں زبان بہت اہم کردار ادا کرتی ہے چنانچہ برصغیر کی تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے ثقافتی افق پر زبانوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

برصغیر میں موجودہ صودی اوائل تک مختلف علاقوں میں جو زبانیں مروج رہیں ان میں اردو، سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی وغیرہ فارسی رسم الخط میں یعنی دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھیں۔ان سب کا عربی و فارسی سے گہرا رشتہ تھا۔اور یہ سب مسلمان صوفیا کرام کے سائے میں پروان چڑھی تھیں اس لیے کہ ظاہر و باطن دونوں میں ایک طرح کی مماثلت وہم رنگی تھی، اس کے برعکس برصغیر کی دوسری زبانیں برج، اودہی، مرہٹی، بنگالی اور جدید ہندی وغیرہ پسی یا ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور اول الذکر زبانوں کے قبیلے سے مختلف تھیں۔

نتیجتاً برصغیر کی متعصب ہندوؤں نے دائیں سے بائیں کو لکھی جانے والی زبانوں کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر جدید ہندی کی اشاعت کو اپنا سماجی فریضہ بنالیا۔ان کے ثقافتی رویے کا رخ ثقافت کے تاریخی حقائق کے بالکل برعکس تھا۔

مسلمانوں کے عہد حکومت تک پورے برصغیر کی تہذیبی وثقافتی اور سرکاری وعدالتی زبان فارسی تھی، فارسی کو ایک ایسے رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی، جس کے ذریعے مسلمان اپنے اندر ملی وحدت کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھ سکتے تھے اور اپنے بعض مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتے تھے، لیکن

انگریزوں کا مقصد چونکہ مسلمانوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر کمزور تر کر کے ان کی انفرادیت و اجتماعیت کو ہر طرح سے ختم کرنا تھا اس لیے دیسی زبان کو فروغ دینے کے بہانے ۱۸۳۷ء میں فارسی کو ہٹا کر اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ محض ایک شعبدہ تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی اس ناراضگی کا سدباب کرنا تھا جو فارسی کو ختم کرنے سے پیدا ہوئی تھی اس لیے کہ جس وقت یہ حکم جاری ہوا اسی وقت میکالے کی وہ تعلیمی یادداشت منظرِ عام پر آئی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں ساری تعلیم انگریزی میں ہونی چاہیے اور جس کا مقصد ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، فکر و نظر اور اخلاقی حکمت و دانش کے اعتبار سے انگریز ہو۔

غیر مسلموں نے جس طرح مسلمانوں کے عہد میں بقول رام گوپال فارسی کو اختیار کر لیا تھا اس طرح انگریزی کو بھی بلا تامل قبول کیا لیکن مسلمانوں کے لیے اس قسم کا فیصلہ کرنا بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ انھوں نے خیال کیا (یہ خیال کچھ ایسا غلط نہ تھا) کہ انگریزی تعلیم کو رائج کرنا مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے دینی و مذہبی عقائد کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے چنانچہ وہ انگریزی زبان سے دور دور رہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۱-۱۸۸۰ء میں جہاں انگریزی ہائی اسکول میں چھتیس ہزار چھ سو چھیاسی ہندو طلبہ زیرِ تعلیم تھے وہاں ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف تین سو تریسٹھ تھی۔

مسلمانوں کی بربادی میں جو تھوڑی بہت کسر باقی تھی وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پوری کر دی۔ مسلمان چونکہ اورنگ زیب سے لے کر ٹیپو سلطان تک برابر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ آگے آگے رہے اس لیے انگریزوں نے سارا غصہ انھی پر اُتارا۔ ملازمت، تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت اور معاش کے سارے دروازے ان پر ایک ایک کر کے بند کر دیئے گئے۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے براہِ راست تاجِ برطانیہ کا راج قائم ہو گیا۔ اب حکومت کی نئی حکمتِ عملی جن اصول کے تحت مرتب کی گئی اس کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لیے بیانات ذیل کو دیکھیے۔

گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

> ''میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اس لیے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرف دار بنائیں۔''

اے ڈبلوڈبلو ہنٹر نے ۱۸۷۰ء میں لکھا:

''مسلمانان ہندوستان، اب اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقے سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہے ہیں۔ مسلمان اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔''

یہ تھے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے وہ تصورات جن کو ذہن میں رکھ کے برطانوی سامراج نے ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پر حکمرانی کی۔ ہندوؤں کو ہر طرح آگے بڑھایا گیا اور مسلمانوں کو ہر شعبہ حیات میں نہ صرف نظرانداز کیا گیا بلکہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے ضیق میں کردی گئی اور اس حد تک کہ ہنٹر جیسے مسلمان دشمن انگریز کو بھی اپنی کتاب کے آخری حصے میں یہ کہنا پڑا:

''مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی کی جارہی ہے۔''

نتیجتاً چھ برسوں کے اندر ہی ہندوؤں کی ذہنیت میں کچھ ایسی تبدیلی آگئی اور ان میں حکومت کی شہ پر کچھ ایسا احساس برتری رونما ہوا کہ وہ خود کو ایک ارفع و اعلیٰ قوم اور مسلمانوں کو ادنیٰ و حقیر خیال کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے صرف دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں انھوں نے حکومت سے یہ مطالبہ شروع کردیا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو ناگری رسم الخط میں رواج دیا جائے اس پر سرسید احمد خاں نے جو اس سے پہلے تک ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے حامی تھے تعجب و تاسف کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ اب ہندو اور مسلمان قومیں ہندوستان میں مل کر نہیں رہ سکتیں۔

یہیں سے دو قومی نظریہ، قوم، قومیت و متحدہ قومیت، ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے موضوعات و مسائل پر بحث کا آغاز ہوا۔

یہ بحث زبان کے مسئلے سے شروع ہوئی تھی اور آخر تک کسی نہ کسی طور پر اس سے منسلک رہی۔ وجہ یہ ہے کہ قوم اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں دوسرے عناصر کے ساتھ جیسا اوپر عرض کیا گیا زبان بھی نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر جمہوری نظام میں جہاں حکومت کا حق انفرادی اکثریت رکھنے والی قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ زبان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کے سیاسی تصورات

سید ارتضٰی حسین

بات جب قائد کی سیاسی بصیرت کی ہو رہی ہو تو شاید یہ بھی کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت بڑی پیچیدہ (Complex) تھی۔ اس میں کئی عناصر ترکیبی کارفرما تھے۔ پہلا تو ان کا مذہبی احساس یا شعور، اگرچہ بظاہر وہ تمام اسلامی شعائر کے سختی سے پابند نہیں نظر آتے تھے۔ جہاں تک عقائد کا تعلق ہے یعنی توحید، رسالت اور قیامت پر کوئی وجہ نہیں ہے ان کے عقیدے کو اتنا ہی مستحکم نہ سمجھا جائے جتنا اور مسلمانوں کا ہے۔ اپنے فقہی مسلک کے عقائد کی وہ اس طرح پابندی کرتے تھے جیسے اس کے دوسرے پیروکار کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں ان کے تاریخی شعور کا بھی بڑا دخل تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے برصغیر کے مسلمانوں کی ایک ہزار چار سو سالہ تاریخ اور خصوصاً مسلمانوں کا عروج وزوال اور زوال کے اسباب۔ ان سب کو ان کا گہرا احساس تھا۔ کوئی بھی سیاسی رہنما قائد کی طرح مسلمانوں کے مزاج اور ان کی اجتماعی آرزوؤں کو نہیں سمجھ سکا۔ تیسرا عنصر ان کا وہ مزاج تھا جو ہر حال میں قانون کے احترام اور قانونی طریقوں کی بالادستی اور اس سے سرمو انحراف کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے جو راہ انھوں نے پسند کی وہ ان کے ذہن کے سامنے بالکل واضح اور غیر مبہم تھی۔ اسی لیے وہ منزل بہ منزل اپنی منازل کے تعین میں کبھی پریشان (Confuse) نہیں ہوئے۔ چوتھے یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے رکھنی چاہیے کہ کامیاب سیاست کے دونوں بنیادی اصولوں کی شناخت ان کے لیے بالکل فطری (Instinctive) ہوگئی تھی۔ پہلے تو یہ سمجھنا کہ کیا چیز ممکن الحصول ہے اور کیا نہیں اور دوسرے کا اندازہ کرنا کہ کس وقت کس مطالبے پر زور دینا چاہیے۔ یہ بصیرت ہر سیاسی رہنما کو حاصل نہیں ہوتی۔

قائداعظم محمد علی جناح کا تہہ بہ تہہ ذہن اگرچہ ان کے کردار کی طرح اقبال کے الفاظ میں پاک

دلی اور پاکبازی کا آئینہ دارتھا۔ان کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو ان کے سیاسی اہداف کا ذکر بہت ضروری ہے اس سلسلے میں یہ سوال اتنا اہم آہنگی(Consistency) کے تعلق (Relevance) کا نہیں ہے جتنا کہ ان کے بنیادی مقصد میں زور دینے(Emphasis) کا ہے۔سوال صرف الفاظ کے ردوبدل کا نہیں ہے بلکہ ایک بنیادی جستجو کا ہے۔

شروع ہی سے یعنی لندن میں طالبعلمی کے زمانے سے جب دادا بھائی نوروجی کے انتخابات میں کارکنی کے وقت سے تین مقاصد ان کے پیش نظر رہے جن کی وضاحت مسلم لیگ کے دسمبر ۱۹۱۲ء میں منعقد ہونے والے بانکی پور کے اجلاس کی تقریر سے ہوتی ہے۔قائداعظم نے اس قرارداد کی حمایت کی جس میں کہا گیا:

"Expanded the leag's goal to include the attainment o<sup>c</sup> self armament suitable to India to be brought about through Constitutional means, a steady reforms of the existing system of administration, by promating national unity and fostering public sprit among the people of India and by Cooperating with other countries."

دوسرے الفاظ میں ہدف کی انھوں نے یوں تعریف کی ہے کہ"خودمختاری کے ایک ایسے نظام کا حصول جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو۔" پھر حصول کے طریقے کی وضاحت ان الفاظ میں کی کہ" آئینی طریقوں کے ذریعے حاصل کیا جائے۔" پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک بنیادی لازمے کی نشاندہی بھی کی کہ حکومتی نظام کی مسلسل اور مضبوط (Steady) اصلاح ہوتی رہے۔دوسرا ذریعہ خودمختاری کے حصول کا یوں بیان کیا کہ اولاً ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کا اتحاد، ثانیاً ہندوستان میں قومی خدمت(Public Sprit) کے جذبے کی حوصلہ افزائی کرنا اور ثالثاً دوسری اقوام(Community) کے تعاون سے۔اگر دیکھا جائے تو...... یہ ان کا سیاسی مسلک ساری زندگی قائم رہا۔اس میں تبدیلی اگر آئی تو حصول کے ذرائع میں آئی، فی نفسہٖ مقصد میں نہیں۔اس کو ان کا بنیادی سیاسی عقیدہ کہنا چاہیے۔اسی وجہ سے قائد ہمیشہ اعتدال پسند، نرم

(Flexible)، آئینی طریقوں کو پسند کرنے والے اور گفت وشنید کے ذرائع پر انحصار کرنے والے نظر آئیں گے۔

یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ مسلم لیگ کے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ہونے والے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے انگریزوں کی طرف سے اس خیال کے بارے میں کہ جمہوری (Democratic) ادارے ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہیں۔سوال کیا......

''کیوں......؟''

ماضی میں ہندو اور مسلمان اس قسم کے اداروں سے واقف نہیں تھے؟

گاؤں کی پنچایتیں کیا تھیں......؟

پھر انھوں نے پوچھا کہ اسلام کی تاریخ اور تعلیمات کیا ہیں؟

اور خود ہی جواب دیا کہ دنیا میں کوئی قوم مسلمانوں سے زیادہ جمہوریت پسند نہیں ہے۔

انگلستان میں بحیثیت طالبعلم انھوں نے جو چار سال گزارے وہ تین اعتبار سے ان کی زندگی پر دائمی نقوش چھوڑ گئے۔ پہلے تو یہ کہ سیاسی طریقے کون سے اختیار کرنا چاہیے۔دوسرے یہ کہ انھوں نے بڑی کوشش کی اور ولایت میں جو ہندوستانی طالبعلم تھے ان کو برابر ترغیب دی کہ ہندوستانی مقاصد کی حمایت کے لیے ان کا خود کو منظم کرنا ضروری ہے۔تیسری چیز جس سے وہ متاثر ہوئے۔وہ ہائیڈ پارک کا انسٹی ٹیوشن تھا۔ جہاں سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اظہار کی آزادی کتنی بنیادی اہمیت اور ناگزیریت کی حامل ہے۔ہاں! یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے دفاع کے لیے وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے اور عملی طور پر بھی اس کی حمایت میں کمی نہ آنے دی۔

اس کے باوجود انھوں نے، جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے اور یہ بات کسی تکرار کی محتاج نہیں ہے، ہندوستان کے لیے جمہوری (Democratic) نظام کو ناموزوں قرار دیا، کیونکہ ایک جمہوری نظام میں جماعتوں کی عددی تشکیل بدلتی رہتی ہے، لیکن ہندوستان میں ایک جماعت یعنی ایک قوم کی مستقل اکثریت اور دوسری کی مستقل اقلیت کی حیثیت ناقابلِ تغیر تھی۔جیسا کہ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا بھی تھا:

"The Trouble is that brother GANDHI is always has three Votes, to brother JINAH's one."

یہ شاید زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ قائداعظم اگرچہ شہری (Civil) فوقیت (Supermacy) اور جمہوری (Democratic) نظام حکومت کے شدت سے قائل تھے اور اس میں وہ کسی صفت کے پیدا ہونے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ فوجی حکمت عملی کا متواتر مطالعہ کرتے رہتے تھے اور جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے، اکتوبر ۱۹۱۶ء میں احمد آباد میں بمبئی صوبے کی کانفرنس کے صدارتی خطبے میں انھوں نے منجملہ اور مطالبات کے اس پر بھی شدت سے اصرار کیا کہ ہندوستانیوں کو آرمی اور نیوی میں کب سے رائل کمیشن دیئے جانے چاہیے تھے اور یہ دلیل دی کہ اگر ہندوستانی سپاہی کی حیثیت سے لڑنے کے لیے موزوں نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ افسر بننے کے لیے موزوں نہیں تصور کیے جاتے۔

اس صدی کے شروع میں ساری دنیا کے ممالک میں سیاسی رہنما اقتصادیات میں دلچسپی کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جنگ آزادی میں شرکت کی دلفریب کشش ایسی تھی کہ لوگ معاشیات کی طرف کم توجہ دیتے تھے لیکن برصغیر کے دونوں عظیم رہنماؤں کی یہ قابل ذکر بصیرت تھی کہ انھوں نے اپنے سیاسی پروگرام میں معاشیات کی اہمیت کو ہمیشہ بہت اہم مقام دیا۔ یہاں ہم کو صرف قائد اعظم کی قیادت کے سلسلے میں گفتگو کرنی ہے اس لیے میں صرف اس اقتباس کو پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

> ''قائداعظم کا سب سے بڑا کردار ان کے اس خوبصورت ادراک کا مضمر ہے جو کہ طلب کی کلیت کو سمجھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک سیاستداں تھے اور انھیں اس بات کا احساس تھا کہ کسی بھی قومی تحریک میں طاقت کے حصول کو اولیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر آپ کے پاس طاقت نہیں ہے تو آپ آزادی کا لطف حاصل نہیں کر سکتے، پرجوش زندگی نہیں گزار سکتے، اپنے سے بڑی طاقتوں اور دھوکے کے مقابلے کے لیے طاقت نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بغیر طاقت کے آزادی نہ تو حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ ہی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔''

قائداعظم نے سب سے پہلی بات جو کی وہ یہ تھی کہ ان کے عوام جانتے ہیں کہ طاقت پیدا کرنے کے لیے علم کا پیدا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ گیارہ سو سال پہلے فردوسی نے کہا تھا:

''توانہ بود ہر کہ دانہ بود''

جیسا کہ کہا گیا کہ سرسید کی طرح ان کا بھی ایمان تھا کہ تمام وسعتوں میں کامیابی کی کنجی تعلیم کے پاس ہے۔قائداعظم نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اپنی تعلیمی پسماندگی کوختم کرنے کے لیے اپنی کوششوں کو دگنا کر دیں۔"

انھوں نے مزید یہ کہا:

"آپ چار چیزیں حاصل کریں تعلیم، تجارت، صنعت اور اسلحہ (دفاع)"

انھوں نے بات کو بڑھا چڑھا کر نہیں کہا بلکہ اپنے پختہ یقین کا اظہار کیا "بغیر تعلیم کے ہر طرف تاریکی تھی اور تعلیم نے ہی ہر طرف روشنی پھیلادی۔ تعلیم ہماری قوم کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ دنیا اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اگر آپ تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے تو یہی نہیں کہ آپ بالکل پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ناپید ہو جائیں گے۔"

یہ طنز آمیز بات لگتی ہے کہ تیسویں دہائی میں کسی وقت جب کہ قائداعظم کو مسلمانوں کے بجائے مسلم لیگ کو منظم کرنے کے فوائد حاصل ہو رہے تھے، اس وقت پنڈت نہرو نے قائداعظم کے متعلق کہا تھا "وہ معاشیات کے بارے میں بالکل نہیں جانتے۔" اس سے دیکھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کس حد تک سیاسی بیانات میں ملوث تھے اور اگر نہیں تو اس سے ان کے نعروں کی سوداگری کا پتہ چلتا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ نومبر ۱۹۴۴ء میں جس کمیٹی کو قائداعظم نے معاشی ترقی کے بارے میں تجاویز تیار کرنے کے لیے کہا تھا لیکن اس کو مناسب تشہیر نہیں ملی۔ قائداعظم کی یہ تحریر ان کے ان مقاصد کا اظہار ہے جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے کمیٹی قائم کی تھی:

"مسلم لیگ خصوصی طور پر ایک سیاسی پارٹی ہے لیکن ہم شعبوں کو الگ نہیں کر سکتے جیسے تعلیم و سماجی بہبود وغیرہ لہٰذا ہمیں مسلمانوں کو معاشی طور پر خود متحد کرنا چاہیے۔ سیاست میں تو مسلم لیگ اپنے طور پر مضبوط ہے۔ معاشی زندگی میں ہم کچھ بھی نہیں تھے۔ اس لیے کمیٹی کا پہلا کام ان معاملات پر غور کرنا ہے جو مسلمانوں کی معاشی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی تجارتی سوجھ بوجھ کو بڑھانا تمھارا پہلا کام ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے چلے گئے:

''تمھیں جن مسائل کا بھی سامنا ہو لیکن تم کو ہر وقت ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارا مقصد امیر کو امیر بنانا اور دولت کو صرف چند ہاتھوں تک ہی محدود رکھنے کا نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کی کمیٹی اس خاص اہم سوال کی طرف بھی توجہ دے گی۔ ہمارا معیار سرمایہ دارانہ نہیں بلکہ اسلامی ہونا چاہیے اور ہمیں عوام کے مفاد کے متعلق سوچنا چاہیے۔''

نتیجتاً کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

''آمدنی میں نمایاں فرق صحیح ہے اور مزدوروں کی اجرت ان میں سے بہت سوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔ حکومت کو ان حالات کو بدلنے کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ اصل مسئلہ سماج مخالف، ذاتی فوائد سے پر لوگوں کو سامنے لانا ہے جو ملکی پیداوار کو بڑھانے سے روکتے ہیں۔ ملک میں افرادی قوت موجود ہے اسے اپنی تکنیکی طاقت بڑھا کر اپنے کو منظم کرنا چاہیے۔''

کمیٹی نے وثوق سے لکھا:

''ایک دوسرے کی مدد کرنا زندگی کا اصول ہونا چاہیے۔ دولت انسان کے لیے بنی ہے، انسان دولت کے لیے نہیں بنا۔ ترقی کا انحصار دولت کا مستقل اور صحیح استعمال ہے تا کہ عوام کو روزگار ملے، ان کی قوت خرید بڑھے اور آمدنی میں اضافہ ہو، اور دولت کی مساوی تقسیم ہو۔ ان باتوں میں حکومت کا دخل اور انفرادی کارعظیم دونوں معاشی تنظیم کے دوسرے ہیں، ان دونوں کے درمیان نیا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔''

ان چیزوں کے حصول کے لیے ہدایتی نکتے یہ ہیں۔ مکمل روزگار، مناسب اجرت اور صحیح قیمت، کمیٹی نے اس طریقہ کار کا کوئی نام نہیں دیا لیکن یہ بتایا گیا کہ ایک عوامی کارپوریشن کچھ ذمہ داریوں اور مقاصد کی تفویض کے ساتھ بنائی جائے جن کا تعین بحث و مباحثہ کے بعد کیا جائے۔ اس طرح عوام کو مکمل اختیار اور ملکیت حاصل ہوگا۔ کارپوریشن کو حکومتی تحفظ حاصل ہوگا، لیکن نجی اداروں کی سی لچک بھی ہوگی۔ کمیٹی نے سائنسی تحقیقات کی ترقی پر زور دیا ہے۔ کمیٹی نے زرعی ترقی کے سوال پر بھی غور کیا۔

قائد اعظم نے ہمیشہ قانون کی بالادستی اور گفت وشنید کی راہ پسند کی ہے۔ ہر ملک کے لیے دو اصول ضروری ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے دنیا کی سیاست میں اپنی آواز شامل کرنی چاہیے اور بین الاقوامی طور پر انصاف کے اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔

انصاف کے اعلیٰ اصولوں پر کار بند رہنے کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ اپنے ابتدائی سیاسی دور میں وہ سخت قومیت پسند اور ہندوستان کی آزادی کے نڈر سپاہی تھے۔ جیسے جیسے آزادی کی امید بندھتی گئی ان کا ذہن مستقبل کے بارے میں متفکر رہنے لگا، لیکن وہ آزادی ہند یا دو طبقوں کے درمیان اختلاف کو دور کرنے کی تدبیر میں لگے رہے تاکہ دونوں میں احساس تحفظ پیدا ہو جائے اور کوئی دوسرے کو نہ دبائے اور دونوں اس طرح زندگی گزاریں جیسی وہ چاہیں، دونوں ملکوں میں اقلیت کا تحفظ ہو۔ انصاف اور انسانیت کے بارے میں ان کے خیالات ان کے ابتدائی اور آخری دور دونوں میں درست اور یکساں تھے۔

◆◆◆

# محمد علی جناح کا تصورِ پاکستان

قطب الدین عزیز

قائداعظم محمد علی جناح کا تصور پاکستان ایک ترقی یافتہ، لبرل انصاف پرست اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ مسلمان ریاست کا تھا۔ ان کے فلسفہ ریاست میں قرآن وسنت، سماجی انصاف، اسلامی جمہوریت، اعلیٰ اخلاقی اقدار، برادر اسلامی اقوام سے اخوت کے روابط اور اقوام عالم کی خدمت کا عزم شامل تھے۔ ان کا یہ بھی عزم تھا کہ حصول آزادی کے بعد پاکستان ان مسلمان اقوام کو جو یورپی نو آبادیاتی نظام میں غلام تھیں ان کو آزادی دلانے میں مدد کرے اور اسلامی ممالک کا ایک بلاک قائم کیا جائے۔ قائداعظم کے تصور پاکستان میں فرقہ واریت، صوبائیت، لسانیت اور رنگ ونسل کے تفرقات اور عصبیتوں کو دخل نہ تھا۔ وہ ایک غیور جرأت منداور راست باز پاکستانی قوم کی تشکیل اور نشوونما چاہتے تھے جو اپنے پاکستانی تشخص میں فخر محسوس کرے اور ان آفاقی اقدار کی علمبردار ہو جو اسلام کے لیے شاندار ماضی کے ادوار میں مسلمانوں کی عظمت کا طرہ امتیاز تھیں۔ تحریک پاکستان کے جہاد میں قائداعظم کا مسلمان قوم کے لیے نعرہ جنگ یقین محکم، اتحاد اور ڈسپلن تھا اور اسی اسم اعظم کو انھوں نے پاکستان کی بنیادوں میں شامل کیا۔ قائداعظم ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور برسوں بمبئی کے مسلمانوں کے ووٹ لے کر اوران کے نمائندہ کی حیثیت سے برصغیر کی برطانوی دور کے قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ وہ اپنے اسلامی تشخص پر فخر کرتے تھے۔ قائداعظم کے تصور پاکستان میں لادینیت Secularism کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ لیکن ملائیت (Theocracy) بھی ان کے فلسفہ ریاست میں شامل نہ تھی۔ احکامات اسلامی اور میثاق مدینہ کی روشنی میں ان کے تصور پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کو آئینی آزادی اور حقوق فلسفہ ریاست کے بنیادی اصول تھے۔ قائداعظم کے تصور پاکستان میں ایسے معاشی نظام کی تشکیل تھی

جس کی بنیاد انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی اصولوں پر ہونی تھی۔ اس معاشی نظام کے تصور میں امارت اور غربت کی فصیلوں کو کم سے کم کرنا اور غربت کو ہٹانا تھا۔ وہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے مخالف تھے۔ وہ حکومت اور نجی شعبہ کے تعاون سے ایک مشترکہ اقتصادی حکمت عملی Mixed Economy کے حامی تھے جس میں تیز رفتار معاشی، صنعتی، زرعی اور سماجی ترقی ممکن ہو سکے اور کسان اور مزدور کو اس کا پورا حق اور اس کی صحیح اُجرت ملے۔

قائداعظم کا پاکستان کے لیے تصور کردہ نظام حکومت وفاقی اور پارلیمانی تھا اور یہی اس عارضی آئین کی اساس تھا جو ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی مدت میں نوزائیدہ مملکت پاکستان میں نافذ ہوا اور قائداعظم اس کے تحت پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیکن قائداعظم نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے کراچی اجلاس میں بحیثیت اس کے پہلے صدر کے جو تقریر کی اس سے آشکار ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا نیا آئین چاہتے تھے جو نظریہ پاکستان اور اسلام کی آفاقی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔ قائداعظم نے اپنی آئین سازی کی مہارت کے باوجود بذات خود کوئی آئین (Constitution) پاکستان کے لیے تحریر نہ کیا اور یہ ذمہ داری دستور ساز اسمبلی کے اراکین پر چھوڑی۔ قائداعظم کے مزاج میں قانون کی بالادستی اور قانون کا احترام اجزائے ترکیبی کی طرح شامل تھے اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ قوم نے آئین سازی کا جو کام انتخاب کے عمل کے ذریعہ منتخب نمائندوں کو دستور ساز اسمبلی میں سپرد کیا تھا وہ کسی فردِ واحد کی مرضی یا فکر کے تابع ہو۔ آزادی صحافت قائداعظم کے تصور پاکستان کا ایک اہم جزو تھی۔ زندگی بھر وہ صحافیوں کے حقوق کا دفاع کرتے رہے اور پاکستان میں ان کے دورِ حکومت میں پوری آزادی صحافت تھی۔

قائداعظم کے تصور پاکستان میں کرپشن اور بے ایمانی سے مبرا ایک ایسی محنت کش انتظامیہ تھی جس کے عمال عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں اور ذمہ دار پبلک سرونٹ ہوں۔ کسی سیاسی پارٹی سے ان کا تعلق نہ ہو اور نہ سیاسیات میں وہ شریک ہوں۔ حکومتِ وقت کے تابع رہیں لیکن کسی سرکاری عمل میں غلط کام کرنے سے انکار کر دیں۔ قائداعظم کرپشن کے دشمن تھے اور بحیثیت گورنر جنرل کے جن ابتدائی قوانین پر انھوں نے دستخط کیے وہ کرپشن کے انسداد کا قانون تھا۔

قائداعظم کوحکومت میں شاہ خرچی کے تصور سے سخت نفرت تھی۔ان کی نگاہ میں انتظامیہ میں داخلہ اور ترقی صرف میرٹ اور قابلیت کی اساس پر ہونی چاہیے۔ان کے تصور میں تعلیم خاص طور سے سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ:

''اردو اور صرف اردو پاکستان کی قومی اور رابطے کی زبان ہوگی۔''

لیکن وہ علاقائی زبانوں کا بھی احترام کرتے تھے۔

قائداعظم کے تصور پاکستان میں ملک کا مضبوط دفاع ایک بنیادی ستون تھا۔وسائل کی قلت کے باوجود انھوں نے فوج، نیوی اور ایئرفورس کی ترقی کو حکومت پاکستان کی اولین ترجیحات میں شامل کیا اور عساکر پاکستان سے قریبی تعلق رکھا۔ پاکستان کے قیام کے ایک سال کے اندر اندر قائداعظم اور وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان نے پاکستان کو ایک مضبوط دفاعی نظام اور مجاہدانہ عساکر سے آراستہ کیا۔

بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں قائداعظم کے تصور پاکستان میں ایک ایسی فعال خارجہ پالیسی تھی جو امن پرستی، صلح و آشتی پر مبنی تھی۔ Peace with in and Peace without قائداعظم کے کلیدی اصولوں میں شامل تھا۔ان کا بار بار ارشاد تھا کہ پاکستان اقوام عالم سے خیر سگالی کا رابطہ اور دوستی چاہتا ہے۔ Good will unto all Malice towards none، ان کا مقولہ تھا۔وہ یورپ کے نوآبادیاتی نظام کے انہدام کے حامی تھے اور انھوں نے پاکستان کو اس جہاد میں شامل کیا۔ بھارت کے مسلمانوں کی حفاظت اور فلاح کو مثالی بنا کر وہ کوشاں تھے کہ بھارت بھی مسلم اقلیت کی پوری حفاظت کرے۔

۱۹۴۵ء کے پیغام عیدالفطر میں قائداعظم نے فرمایا:

> ''قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر اور بالاترین ضابطہ حیات ہے۔اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جو پورے معاشرے کو منظم رکھتا ہے اور زندگی کے ہر ایک شعبہ کو مرتب کرتا ہے۔''

۱۱، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو افسران حکومت پاکستان سے کراچی میں قائداعظم نے فرمایا:

> ''پاکستان کی تخلیق ایک وسیلہ ہے...... ہماری اپنی ایک اسٹیٹ ہو جس کے اندر ہم آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرسکیں اور جہاں اسلامک سوشل جسٹس کے اصول روبہ عمل لانے کی فضا ہو۔''

۱۴، فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں قائداعظم نے کہا:

''آیئے ہم لوگ اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔ ہمارے خدائے عزوجل نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام اموراور فیصلے بحث وتمحیص، مشاورت اور مساوات کی رہنمائی میں ہوں۔''

۲۱، فروری ۱۹۴۸ء کو Ack Ack رجمنٹ سے مالیر میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:

''آپ کو ایک محافظ کی طرح نگرانی کرتے رہنا ہے کہ اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشل جسٹس اور مساوات آپ کی سرزمین میں کس طرح نشوونما پاتی ہیں اور قائم رہتی ہیں۔''

۱۹، فروری ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے آسٹریلیا کے نام نشری تقریر میں ارشاد فرمایا کہ پاکستان میں اسلامی اقدار کی بالادستی کے باوجود پاکسان میں Theocracy یا ملاّئی نظام نہ ہوگا۔

۱۲، اپریل ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء کو قائد کا پیام تھا کہ وطن سے وفاداری کے فریضے کو اولیت حاصل ہے۔ ہمارے صوبائی فرائض، ضلعی فرائض، شہری فرائض اور ہمارے گاؤں اور ہماری ذات کے فرائض دوسرے درجہ پر آتے ہیں۔ طالبعلموں! یادرکھو ہم ایک ایسی مملکت کی تعمیر کررہے ہیں جو ساری اسلامی دنیا کی تقدیر سازی میں بھرپور حصہ لینے والی ہے اور اپنا کردار ادا کرنے والی ہے۔ ہمیں اپنے اندر حب الوطنی کا ایسا شعور پیدا کرنا ہوگا جو ہم سب کو سمیٹ کر ایک دوسرے میں ملا کر مضبوط قوم میں ڈھال دے۔

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں قائد اعظم نے کہا:

''ہمیں دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہوگا جس کی بنیاد انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف (Social Justice) کے سچے اسلامی اصولوں پر ہوگی۔''

۲۶، مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹا گانگ میں بھی قائداعظم نے اسلامک سوشل جسٹس پر زور دیا۔

•••

# قائدِاعظم کا تصورِ تعلیم

مختار زمن

قائداعظم محمد علی جناح کی مصروف زندگی میں درس و تدریس، طلبا و طالبات بہت مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ شروع سے ہی تعلیم اور کردار سازی کی طرف بہت توجہ دیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اچھی تعلیم ہی کردار سازی کے عمل میں امداد کرتی ہے۔ وقت خراب کرنے، بے کار بیٹھنے اور کام سے جی چرانے والے رویے انھیں سخت ناپسند تھے۔ چنانچہ اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں وہ برٹش میوزیم کے رکن ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف کتابیں پڑھتے تھے بلکہ پارلیمنٹ کی گیلری میں جا کر گلیڈسٹون اور جوزف چیمبرلین جیسے اعلیٰ مقررین کی تقریریں سنتے اوران کے زبان و بیان پر غور کرتے تھے۔ ان کی یہ دلچسپی اس وقت بھی قائم رہی جب وہ واپس بمبئی آ گئے۔ بمبئی کے اس وقت کے ایسے اداروں سے ان کا تعلق قائم رہا جو طلباء کے لیے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی کے مسلم طلباء کے ادارے میں تقریر کرنے اور انھیں مشورہ دینے کا کام جاری رکھا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ پھر انگلستان گئے تو کیکٹس ہال ویسٹ منسٹر میں انھوں نے ایک پبلک میٹنگ میں شرکت کی حامی بھر لی اس جلسے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک سینٹرل ایسوسی ایشن بنایا جائے جس میں برصغیر سے آنے والے طلباء اور طالبات شرکت کریں۔ اپنی تقریر میں انھوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ طالب علم روزانہ کی پالیٹکس میں حصہ نہ لیں اس لیے کہ سیاست ایک خطرناک کھیل ہے۔ اس سے بچ کر چلنے اور فضول آراء اور خیالات کو دور رکھنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ ہاں اپنی تعلیم ختم کر کے جب وہ برصغیر میں واپس جائیں تو مشنری جوش و خروش کے ساتھ اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ایسے خیالات کا پرچار قائداعظم ہمیشہ کرتے رہے۔ مگر وہ طلباء و طالبات کو گونگے بہرے بن کر زندگی گزارنے کے بھی خلاف تھے۔ انھوں نے بارہا کہا کہ طلباء کو اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنا

چاہیے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سیاسی لیڈر اور حکومت جو قدم اٹھا رہی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا دراصل وہ تو اس بات کے حق میں بھی نہیں معلوم ہوتے تھے کہ دوسروں کے روپے پر سیاست لڑائی جائے۔ اسی لیے وہ تعلیم و تدریس پر اولین زور دیتے تھے۔ اس کے بعد اسی تعلیم سے ترقی ممکن تھی۔ اور پھر اس سے سیاست کے دروازے کھل جاتے تھے۔ خود ان کا بھی رویہ یہی رہا۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی مسلم اسٹوڈنٹس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے طلباء سے اپیل کی کہ وہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے ابھی سے تیار ہو جائیں۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ جب پاکستان معرض وجود میں آجائے تو فوراً تربیت یافتہ عملہ میسر آئے۔ ۲، مارچ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک خصوصی اجلاس سے خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ:

> ''قوم اسی وقت قابل اعتماد ہوگی جب تین باتوں پر اس کا دارومدار ہوگا۔ ان میں اولین بات تعلیم ہے۔ تعلیم کے بغیر آپ کا وہی حال ہوگا جو ہمارا کل رات کو تھا جب روشنی گل ہوگئی تھی۔ تعلیم کے بعد ہم اسی طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے پھیلی ہوئی دن کی روشنی میں۔ دوسری بات یہ کہ کوئی آدمی یا آدمیوں کا کوئی گروہ تجارت وصنعت کے بغیر آگے قدم نہیں اٹھا سکتا اور جب تعلیم کی روشنی کے باعث آپ اقتصادی اور صنعتی طور پر مضبوط ہو جائیں گے تو بیرونی حملے کے خلاف دفاع کر سکیں گے اور اندرونی امن و امان قائم رکھ سکیں گے۔ لہٰذا دفاع کے لیے بھی تعلیم و تدریس اہم قرار پائی۔''

۲، نومبر ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ:

> ''میں یہ پٹا ہوا فقرہ نہیں دہراؤں گا کہ آج کے نوجوان کل کے لیڈر ہیں۔ لیکن یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بہت جلد نوجوانوں ہی کو جدوجہد کی مشکلات برداشت کرنی پڑیں گی۔ اور کاروباری آدمیوں کی طرح ہمیں یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے۔''

دراصل یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قائداعظم ان سیاست دانوں میں تھے جو نوجوانوں کو بہت

اہمیت دیتے ہیں۔اورنو جوانوں کے ذہنوں کو تعلیم ہی سے جلا ملتی ہے۔وہی ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار،ان کی سوچ کو دوررس اوران کے عمل کوسودمند بنا سکتی ہے۔اسی لیے قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کو عوامی، فعال اوراہم جماعت بنانے کے فوراً بعد آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھنے کا کام سنبھالا۔اوراس کی پہلی سالانہ کانفرنس کلکتہ میں ۱۹۳۷ء میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اس کا آئین بنانے اور دوسرے قیمتی مشورے دینے میں مدد دی۔ظاہر ہے کہ طلباء کا کوئی ادارہ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک زیور تعلیم سے آراستہ نہ ہو۔اس لیے تعلیم کو کلیدی اوراہم حیثیت سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔مگر طلباء کے لیے وہ روزمرہ کی سیاست بازی کے مخالف تھے۔ چنانچہ ۲۶، دسمبر ۱۹۴۱ء انھوں نے ناگپور میں لڑکوں سے کہا:

> ''میں نے بار بار یہ نکتہ دہرایا ہے کہ طالبعلمی کے دوران سیاسی معاملات میں جو روز بروز، ہفتہ بہ ہفتہ اور ماہ بہ ماہ بدلتے رہتے ہیں، آپ کو حصہ نہیں لینا چاہیے کیونکہ آپ کو اپنی خاطر، اپنے والدین کی خاطر اوراپنی قوم کی خاطر اپنی پوری توجہ تعلیم کی طرف دینی چاہیے یادرکھیے کہ اگر آپ نے ان باتوں میں اپنا قیمتی اور بیش بہا وقت ضائع کیا تو وہ کبھی واپس نہیں آئے گا لیکن گھر آپ کا اولین فرض آپ کے اپنے لیے، اپنے ماں باپ کے لیے اورقوم کے لیے ہے، آپ کو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ترقیوں سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔جو نہ صرف اس ملک میں ہورہی ہیں بلکہ بیرونی دنیا میں بھی نظر آتی ہیں۔''

راولپنڈی میں ۸، ۷ مارچ کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے پھر تعلیم وتربیت پر زور دیا۔اپنے پیغام میں انھوں نے کہا کہ آج جو کچھ صورت حال درپیش ہے ظاہر ہے کل اس کی باگ دوڑ آج کے طلباء کو سنبھالنی ہے۔پس انھوں نے کہا کہ:

> ''جو ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر پڑنے والی ہیں کیا آپ نے ان کے لیے تربیت حاصل کرلی ہے؟ اور کیا ڈسپلن اور سب کیل کانٹے سے لیس ہو چکے ہیں؟ اگر نہیں تو آج ہی سے یہ کام شروع کردیجیے۔یہی مناسب وقت ہے اور میں آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔''

قائداعظم لڑکوں اور لڑکیوں پر پورا اعتماد کرتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ پاکستان کی جنگ

میں یہی لوگ ساتھ دیں گے چنانچہ اسلامیہ کالج جالندھر میں انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد طلباء اور طالبات ہی پبلک لائف میں آئیں گے۔ ۱۵،نومبر ۱۹۴۲ء کو انھوں نے مسلم طلباء کے جالندھر اجلاس میں پھر اپنے خطاب میں کہا کہ:

"وہ اس سیاسی جدوجہد میں ذاتی طور پر ملوث نہ ہوں جو جاری ہے۔ بلکہ تعمیری کام کریں یعنی عوام کی اقتصادی ترقی اور تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیں۔ اسلامی کلچر کی تدریس میں شریک ہوں اور مختلف اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کریں۔"

قائداعظم خواتین کو کبھی نہ بھولے تھے۔ انھوں نے مختلف شہروں میں لڑکیوں سے خطاب کیا۔ جو لوگ خواتین کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں وہ اپنے غلط مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

بمبئی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے انھوں نے ۲۵، جنوری ۱۹۴۳ء کو خطاب کیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ طلباء کو بین الاقوامی ترقی اور اندرون ملک ترقی پر کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ جو کچھ براعظم میں ہو رہا ہے وہ دنیا سے الگ ہو کر نہیں سوچا جا سکتا۔ اس لیے پڑھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ۴، اپریل ۱۹۴۳ء کو صوبہ سرحد کے طالب علموں سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ:

"ہماری ہدایت اور ہمیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے قرآن شریف کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کا علم مسائل کا حل ہے۔"

بلوچستان میں انھوں نے ۴، جولائی ۱۹۴۳ء کو جو خطبہ دیا تھا وہ بڑا قابل قدر ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ:

"جب تک آپ طالب علم ہیں روزانہ کی سیاست میں حصہ نہ لیں، سستے نعروں کی طرف توجہ نہ کریں بلکہ اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ دیں۔"

انہوں نے پھر زور دے کر کہا کہ:

"والدین، قوم اور خود طلباء کے لیے ان کا پہلا فرض تعلیم حاصل کرنا ہے جب تک وہ تعلیم سے اپنے کو تیار نہ کریں گے کامیابی ممکن نہیں۔"

جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ وہ بار بار خواتین کی بہبود، ترقی اور تعلیم پر زور دیتے تھے۔

انھوں نے ۹، مارچ ۱۹۴۴ء علی گڑھ یونیورسٹی یونین میں عورتوں کی ترقی پر زور دیا اور ۲۷ مارچ، ۱۹۴۴ء کو بھی اسلامیہ کالج برائے خواتین کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پھر اسی موضوع پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ:

''مسلم طالبات کو صحیح قسم کی تعلیم کے مواقع ملنے چاہیے۔''

گجرات میں ۱۴، جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی۔ قائداعظم نے اس کانفرنس پر زور دیا کہ مسلمان طلباء، تجارتی، سائنسی اور تکنیکی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ قانون کی ڈگریاں لینے کے بجائے ان خطوط پر تعلیم سخت ضروری ہے۔ ۱۵، جنوری ۱۹۴۵ء کو احمد آباد میں کہا کہ:

''طلباء کا اولین فرض تعلیم و تربیت ہے۔ اپنی چھٹیوں میں انھیں اس کی کوشش کرنی چاہیے اور سماجی خدمت انجام دینی چاہیے۔''

یہ تو تھی ان کی سیاست لیکن مرکزی اسمبلی میں بھی وہ طلباء اور تعلیم کی ضرورت کو کبھی نہ بھولتے۔ چنانچہ جب مسٹر گوپال کرشن گوکھلے نے پرائمری ایجوکیشن بل پیش کیا تو اس کے حق میں سب سے زیادہ پر جوش آواز محمد علی جناح ہی کی تھی۔ یہ تقریر ۱۹۱۲ء میں کی گئی تھی۔ قائداعظم نے کہا کہ:

''عوام کی فلاح اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ اصول تسلیم کرلیا جائے کہ تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔''

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ قائداعظم کی نظروں سے تعلیم و تربیت اور بہتر انسان بنانے کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں تھا۔ ان کا تصور تعلیم یکطرفہ سکڑا ہوا اور محدود نہیں تھا۔ ایک طرف تو وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی تعلیم دینا چاہتے۔ دوسری طرف وہ پائلٹ بھی ٹرین کرنا چاہتے تھے جو ہمارے بھاری جہاز اڑائیں، وہ بینکوں میں مسلم نوجوانوں کو بھرتی کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے مرزا احمد اصفہانی کو اُن کے بھائی مرزا ابوالحسن اصفہانی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ اورینٹ ایئرویز قائم کریں۔ مسلم چیمبرس آف کامرس بنائیں اور پاکستان کے قیام سے پہلے ایسے نوجوان تعلیم و تربیت سے لیس کردیں جو اس ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ جس دن پاکستان بنا تو ہندو بینکر، ہندو ماہرین، ہندو کاروباری لوگ، ملیں، فیکٹریاں، بندرگاہ، ہوائی اڈوں کا تربیت

یافتہ عملہ چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن قائداعظم کی دوربینی کام آئی۔ پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش خود ختم ہوگئی اور آج ہم پاکستان کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں۔ بے شک خراماں خراماں ہی۔ رشوت، اقربا پروری، فرقہ پرستی کی لعنتیں ہیں لیکن یہ سب کے ساتھ لگا رہتا ہے اصل بات یہ ہے کہ جس ملک کے متعلق پٹیل اور دوسرے کانگریسی یہ سمجھتے تھے کہ یہ چل نہیں سکتا۔ یہ ہندوستان سے ملنے کی دست بستہ خواہش کرے گا اور اس وقت ہندوستان اس کی شرائط نہیں اپنی شرائط منوائے گا۔ وہ ملک اپنے پچاس سال پورے کر چکا ہے۔ اب وہ بہت بڑا اور بہت اہم ملک بن چکا ہے۔ یہ جشن آزادی پاکستان کی کامیابی و کامرانی کی دلیل ہے۔ بے شک یہ ملک قائم رہنے کے لیے معرض وجود میں آیا ہے۔

◆◆◆

# قائدِاعظم......تصورات اور مشن

پروفیسر شریف المجاہد

قائداعظم نہ صرف اندرونی ملک بلکہ بیرون ملک بھی امن وامان کے خواہاں تھے۔ وہ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔'' کے اصول پر ایمان رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ 1930ء کے بعد کے عشرے میں جب ہندوؤں اور کانگریس نے اس اصول کو بے جانے بوجھے تج دیا اور اس کے برعکس اور متضاد راہ اختیار کی تو ایسے رویے اور بعض دیگر عوامل نے قائداعظم کو بالآخر مطالبہ پاکستان پر مجبور کر دیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ خود مطالبہ پاکستان بھی جیسا کہ خود قائداعظم نے وضاحت کی۔ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے اسی اصول کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ یعنی مطالبہ پاکستان کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر اپنے نظریات، خیالات اور روایات کے مطابق اپنے اپنے امور کی نگرانی کریں تاکہ برصغیر میں دونوں قوموں کے لیے امن اور خوش ہمسائیگی کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس تشریح اور توضیح سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ دراصل پورے براعظم ہندوستان کی آزادی کا طالب تھا۔ اس طرح گویا قائداعظم نہ صرف پاکستان کے لیے مصروف تھے بلکہ ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کی آزادی یعنی ہندوؤں کی آزادی کے لیے بھی جدوجہد کر رہے تھے۔

تاہم آزادی کے لیے قائداعظم کا یہ جوش وخروش صرف مسلمانوں یا ہندوستان کی حد تک محدود نہ تھا۔ یہی جوش وولولہ ان تمام محکوم قوموں کے لیے بھی ان کے دل میں موجزن تھا جو غیر ملکی راج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمہ وقت، پورے انہماک اور تندہی کے ساتھ اپنے کروڑوں عوام کے لیے جدوجہد آزادی میں مصروف تھے،

وقت نکال کر انہوں نے کئی مواقع پر ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی اپنی اور اسلامیان ہند کی طرف سے مکمل اخلاقی حمایت بھی کی۔ خاص طور پر مغرب (شمالی براعظم افریقہ کے مغربی مسلم ممالک) میں فرانسیسی نوآبادیوں، افریقہ میں سابق اطالوی نو آبادیوں، مصر، مشرق وسطیٰ اور انڈونیشیا میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی انہوں نے کھل کر حمایت کی۔ اسی بنا پر نوآبادیاتی ممالک کے محکوم عوام کی آزادی کی حمایت قیام کے وقت ہی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول بن گئی۔

جناح تمام اقوام عالم سے دوستی کے قائل تھے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی معاملات میں دیانت، انصاف اور ایمان داری پر یقین رکھتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہندوستان کی طرف سے مستقل یہ کوششیں جاری تھیں کہ کسی نہ کسی طرح گلا گھونٹ کر پاکستان کو مار دیا جائے۔ ان کی طرف سے ہندوستان کو ہمیشہ شاخ زیتون ہی پیش کی گئی۔ انہوں نے ہر ایک کو عفو و درگزر سے کام لینے کی تلقین کی۔ ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں باہمی دشمنی ترک کر دیں۔ دلوں کو تمام تلخیوں اور کدورتوں سے پاک کر دیں اور تشدد کے تمام تصورات ذہنوں سے نکال دیں۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تمام اختلافات کو ہمیشہ پرامن طریقے سے حل کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے براعظم ہندوستان کے لیے ''منرو نظریہ'' کے مطابق کسی نہ کسی قسم کا کوئی انتظام قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا، بھارت کو مشترکہ دفاع کی تجویز بھی پیش کی۔

قائداعظم ملت مسلمہ کے مکمل اتحاد کے بھی علمبردار تھے۔ 1920ء کے بعد کے عشرے میں جب ترک قوم اپنی جہد بقا میں مصروف تھی قائداعظم نے اس سے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ قرطاس ابیض (1939ء) اور پھر 1930ء اور 1940ء کے بعد کے عشروں میں یہودیوں کی نقل مکانی اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں انہوں نے برطانیہ سے یقین دہانیاں حاصل کر لی تھیں۔ 1947ء اور 1948ء کے دوران جب انڈونیشیا پر ولندیزیوں نے دوبارہ قبضہ جمانے کی کوشش کی تو قائداعظم نے اس پر سخت نکتہ چینی کی اور جوابی اقدام کیے۔ 1949ء سے 1951ء کے دوران پاکستان کے زیر اہتمام جو چند بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں ان کا تصور قائداعظم کی فکر کا نتیجہ تھا۔

قائداعظم کا سماجی فلسفہ اخوت، مساوات، بھائی چارے اور عدل عمرانی کے انسانی دوست

اصولوں پر یقین محکم سے عبارت تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ برِاعظم ہندوستان میں انسانی حقوق سے محرومی کے خدشے اور خطرے نے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو قیام پاکستان کے مطالبہ پر مجبور کیا تھا۔ اسی لیے وہ اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان کی تعمیر عدل عمرانی کی ٹھوس بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ انہوں نے پرزور انداز میں تلقین کی کہ پاکستان کی سرزمین سے ہر قسم کے استحصال کا خاتمہ کر دیا جائے۔ انہوں نے دولت مندوں کو مشورہ دیا کہ بدلتے ہوئے حالات میں وہ اپنا انداز فکر تبدیل کر لیں۔ انہوں نے سرکاری افسروں پر زور دیا کہ وہ ایک ایسی فضا کو جنم دیں اور ایسے جذبے اور لگن سے کام کریں کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف ہو سکے اور اس کو اپنا حق مل سکے۔
قائداعظم جمہوریت پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ اس بات کے بھی سختی سے قائل تھے کہ پاکستان کے مستقبل کے آئین میں اسلام کے بنیادی اور لازمی عنصر کا اظہار ہونا چاہیے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام اور اس کے تصورات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔'' انہوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ اسلام کے عظیم الشان اصولوں ہی کو پاکستان کا رہبر و رہنما ہونا چاہیے۔ وہ حقوق، مراعات اور فرائض میں مساوات، ہر ایک سے ہر معاملے میں حق و انصاف سے کام لینے اور کسی تفریق کے بغیر سب لوگوں کے لیے مساوی شہریت کے قائل تھے۔

اپنی قوم کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرنے والے جناح نے صرف اپنی قوم کی فلاح اور بقا کے لیے مطالبہ پاکستان کو اپنا مسلک بنایا۔ یہ مطالبہ کیونکہ اپنی اصل میں نہایت غیر معمولی اور غیر روایتی تھا۔ اس لیے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کا غلطی کرنا اور اس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونا لازمی امر تھا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر ان کی شدید مخالفت اور مزاحمت بھی لازمی تھی تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ انہیں نہ صرف اس دور میں غلط سمجھا گیا بلکہ آج بھی بعض لوگ ان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں تاہم یہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس عظیم رہنما اور اس کے عظیم مشن کو سمجھنے کی اور اس کی عظمتوں کو تسلیم کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کیونکہ مخالفانہ جذبات کی گرداب حقائق سے چھٹنے لگی ہے۔ چنانچہ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ عصر حاضر میں شاید ہی کسی اور رہنما کو اتنے شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہو جن الفاظ میں جناح کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تعریف ایسے لوگوں نے بھی کی ہے جو ان کے نظریات کے مخالف تھے۔ آغا خان کا کہنا ہے ''میں جتنے لوگوں سے ملا ہوں وہ ان سب سے عظیم تھے۔''

''ورڈکٹ آف انڈیا'' کے مصنف بیورلی نکلس نے انہیں ایشیا کا انتہائی اہم شخص قرار دیا ہے اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے جو 1948ء میں مغربی بنگال کے گورنر تھے ان کے بارے میں کہا ہے۔

''وہ اس صدی کے سب سے ممتاز فرد تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔''

عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل عبدالرحمٰن عظام پاشا نے انہیں عالم اسلام کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ مفتی اعظم فلسطین نے ان کی موت کو تمام عالم اسلام کے لیے ایک ''عظیم نقصان'' قرار دیا ہے۔ تاہم قائداعظم کی ذاتی اور سیاسی کامیابیوں کو نہایت جامع انداز میں انڈین نیشنل کانگریس کے فارورڈ بلاک ونگ کے سربراہ سرت چندر بوس نے چند الفاظ میں سمو دیا ہے۔

1948ء میں قائداعظم کے انتقال پر انہوں نے کہا۔ ''مسٹر جناح ایک وکیل کی حیثیت سے عظیم تھے۔ ایک کانگریسی کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلم ہے۔ وہ مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے بھی عظیم تھے۔ ایک عالمی سیاستدان اور مدبر کی حیثیت سے بھی وہ عظیم رہے اور ایک عملی انسان کی حیثیت سے وہ عظیم ترین تھے۔ مسٹر جناح کے انتقال سے دنیا ایک عظیم ترین مدبر اور پاکستان اپنے خالق، فلسفی اور رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔

یہ تھی قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت اور یہ تھا ان کا مشن۔ یہ تھیں ان کی کامیابیاں اور ان کی کامرانیاں۔ اس لیے اگر آج بھی قوم انہیں احسان مندی اور تشکر کے جذبات سے یاد کرتی ہے اور اگر آج بھی 8 کروڑ پاکستانیوں کے ذہن میں ان کی یاد ہمیشہ کی طرح تازہ ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگرچہ انہیں جدا ہوئے ایک تہائی صدی گزر چکی ہے لیکن آج بھی پاکستان کی سیاسی زندگی پر ان کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ پاکستان کے لیے ان کے ارشادات آج بھی متنازعہ مسائل اور سیاسی تنازعات میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان جس کا قیام ایک معجزہ ہے صرف ایک شخص کی بے مثل سیاسی بصیرت اور ذہانت کی زندہ علامت ہے اور وہ شخص ہے قائداعظم محمد علی جناح۔

◆◆◆

maablib.org

# قائد کی شخصیت اور تصورات

مضمون: عبدالغفور بھرگڑی

مترجم: پروفیسر آفاق صدیقی

اس سے زیادہ کون سی بے حسی اور بد قسمتی ہو سکتی ہے کہ قوم اپنے محسن کو بھول گئی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت تاریخ ساز شخصیت تھی جس نے اپنی انتھک جدوجہد، غیر متزلزل استقامت، اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور سچائی کے ذریعے دنیا کے نقشے پر بڑی سے بڑی مسلم اسٹیٹ اور دنیا کی پانچویں بڑی مملکت قائم کی۔ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اگرچہ اپنی غلطیوں، عاقبت نااندیشیوں اور بے انصافیوں کے سبب ہم سے مشرقی پاکستان (یعنی مشرقی بنگال) الگ ہو گیا مگر اس کے قصوروار اور ذمہ دار وہ ہیں جنھوں نے قائداعظم کی وفات کے بعد ملک کی باگ ڈور سنبھالی جن کو وطن سے زیادہ ذاتی اقتدار سے محبت تھی۔ جنھوں نے انصاف کی بجائے اقربا پروری کی جنھوں نے دیانت داری کی قدروں کو پامال کیا۔ جنھوں نے پاکستان کو مالِ غنیمت سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور قائد کے اصولوں کو ہوا میں اچھال دیا۔ محبِ وطن شہری یہ سب کچھ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے رہے مگر وہ بے بس تھے اور بے کسی کے آنسو اپنی آنکھوں سے چھلکاتے رہے:

حیف کہتے ہیں متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

قائداعظم کا تعلق نہ جاگیرداروں اور زمین داروں سے تھا اور نہ ہی کسی صنعتکار سرمایہ دار طبقے سے تھا اور نہ قارون کا خزانہ کہیں سے ہاتھ لگا تھا بلکہ انھوں نے اپنی خداداد لیاقت کے ذریعے اپنی دنیا آپ بنائی تھی۔ وہ متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ پایہ کے ایک بے مثال بیرسٹر تھے۔ اپنی رات دن کی محنت، بے پناہ صلاحیتوں اور بلند ہمتی سے وہ وکالت میں پورے ہندوستان کے اندر ممتاز

حیثیت کے مالک بن گئے اس کامیابی میں ان کی والدہ مرحومہ اور پیارے والد کی دعائیں ضرور شامل تھیں۔ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ اپنے بڑوں سے سیاست، دولت اور شہرت ان کو ورثے میں نہیں ملی تھی جس کو بیساکھی بنا کر وہ ترقی کی منزلیں طے کرتے رہتے ان کی زندگی ایک غریب پڑھے لکھے نوجوان کے لیے اعلیٰ مثال، زریں سبق اور مشعلِ راہ ہے۔

وہ ایک قد آور، خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش مزاج نوجوان تھے اور اپنے کیسوں میں مکمل تیاری کر کے اعلیٰ عدالتوں کا رخ کرتے اور کیس کو آگے بڑھاتے تھے۔ ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت اور جج صاحبان کے نزدیک بڑی عزت ہوتی تھی اس لیے جلد ہی ہندوستان کے اول درجے والے بیرسٹروں میں ان کا شمار ہونے لگا:

کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

(کمال حاصل کرو تاکہ جیتے جی دنیا میں عزت حاصل ہو)

قائداعظم کو بجا طور پر ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر کہا جاتا تھا۔ جس کے لیے تاریخ کے صفحات گواہ ہیں۔ ہندوستان کے کسی بھی رہنما نے ہندو اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کی جتنی مسٹر محمد علی جناح کرتے رہے۔ وہ نہ دیوبند کے دارالعلوم کے طالب علم تھے اور نہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی جو اسلامی عروج کا عظیم ادارہ تھا۔ وہ ۱۶ برس کی عمر میں لندن گئے اور لگاتار چار سال وہاں رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی۔ چھوٹی عمر میں ہی انھوں نے انگریزوں کے علمی، سیاسی، سماجی اور معاشی ادارے دیکھے ان کا مطالعہ کیا اور ان سے متاثر ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہاں کی سیاسی آزادی کی موجوں اور بہاروں کو بھی دیکھا جنھوں نے ان کے دل و دماغ پر ہندوستان کی غلامی کا ان مٹ احساس پیدا کیا۔ انگلستان میں بھی ان کا واسطہ ان سیاسی رہنماؤں سے پڑا اور ان کے زیر اثر آئے جو صرف برائے نام نہیں بلکہ حقیقی قوم پرست تھے۔ جن میں تعصب کی بدبو ذرہ برابر نہ تھی بلکہ حب الوطنی اور قوم پرستی کی خوشبو ان میں سمائی ہوئی تھی۔ یہ قوم پرستی یکطرفہ ہرگز نہ تھی بلکہ ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ تھی۔ اسی لیے جب مسٹر جناح نے برطانیہ کو خیرباد کہا تو وہ ایک دانش مند، باکردار اور ہندوستانی قومیت پر پختہ یقین رکھنے والے نوجوان تھے اور ان کی سیاسی زندگی کی ابتداء آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہی ہوئی۔

محمد علی جناح کی سیاسی زندگی تو بے شک شہرۂ آفاق ہے مگر کم لوگوں کو خبر ہے کہ وہ بڑے پارلی

۱

میٹیر یرین بھی تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۷ء تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے اور وہاں انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر رہے جس میں مسلم اور غیر مسلم ممبر شامل تھے۔ ان کی تقریریں لاہور کے موچی دروازے والی نہ ہوتیں جہاں سیاسی لیڈر کیا کیا کچھ نہ کہہ جاتے ہیں اور عوام کے جذبات سے کھیل کر ان کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ سیاست کی اپنی زبان ہوتی ہے اور قائداعظم وہی زبان استعمال کرتے تھے۔ جناح صاحب اسمبلی کے ایوان میں ایک ایک لفظ بڑی احتیاط سے ناپ تول کر سلیقہ مند اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ ان کی تقریر میں فصاحت بھی ہوتی تھی اور بلاغت بھی حقائق سے بھر پور ہوتی تھی۔ اپنی مہذب سیاسی زبان میں وہ نہ صرف انگریزی حکومت کے باتدبیر وزیروں کو بلکہ وائسرائے کو بھی ایسی سناتے تھے کہ ان کی سٹی گم ہو جاتی تھی اور کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ قائداعظم کی تقریریں منفی نہ تھیں بلکہ ان میں دلیلوں سے الجھے ہوئے مسائل حل کرنے کی خوبی اور صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان کی عام جلسوں کی تقریریں بھی مدبرانہ، متوازن اور حقیقت کے جذبوں سے بھر پور ہوتی تھیں۔ جن میں سیاسی بازیگری نہیں بلکہ تنگ و تاریک سرنگ سے نکلنے کے لیے روشنی نظر آتی تھی۔

وکالت ہو چاہے سیاست یا زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو مسٹر جناح نے ہر شعبے میں کمال حاصل کیا سیاست، وکالت، آئین، قانون اور ہر بات میں انھوں نے اپنے آپ پر کسی کی بالادستی اور فوقیت قبول نہیں کی تھی کیونکہ بجا طور پر وہ خود اعتمادی کے مستحق تھے۔ محترم مولانا ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر میں ایک جگہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اب سوچتا ہوں تو حسرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ وہ بھی کیسا زمانہ تھا۔ طبیعت میں کیسے کیسے ولولے تھے۔ میری عمر اس وقت سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس وقت بھی طبیعت یہی چاہتی تھی کہ جس میدان میں قدم رکھیں تو مکمل طور پر رکھیں اور جیسے ہی راستہ ملے ویسے ہی آگے بڑھتے رہیں۔ میری طبیعت اس بات پر آمادہ نہ ہوئی کہ کسی کام کو ادھورا چھوڑا جائے۔''

جو کچھ مولانا نے کہا وہ سچ ہے مگر اب جوانی کی جولانیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے مولانا حسرت سے ہاتھ مل رہے تھے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جوانی کا جوش وخروش، جذبہ اور صحت و طاقت انسان کا انمول خزانہ ہیں۔ جوانی ختم ہوتے ہی عملی قوت بھی کمزور ہو جاتی ہے:

جب کشتی ثابت وسالم تھی ساحل کی تمنا سب کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

مگر جناح صاحب نے اپنی زندگی کی بڑی سے بڑی سیاسی جنگ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی جنگ اس وقت لڑی جب ان کی جوانی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ جسمانی طور پر کمزور تھے بیمار تھے لیکن ان کے بلند عزم (Will Power) کا کیا کہنا جس کے سہارے وہ نہ صرف زندہ رہے بلکہ ساری جنگِ آزادی لڑی اور فتح پائی۔ اگر چہ ان کو رستہ نہ بھی ملا تو انھوں نے اپنا رستہ خود ہی بنا لیا۔ وہ سیاسی اور قومی فرہاد تھے جس نے پہاڑوں کو چیر کر نئی نہریں نکالیں اور نیا نگر آباد کیا:

«جبل ماري حبک جو اڏو آريجن کي» شاھ

اس حقیقت کی شہادت ہز ہائنس سلطان محمد شاہ آغا خان نے اپنی خود نوشت میں اس طرح دی ہے:

''وہ سبھی سیاستداں جن کو میں نے دیکھا ہے مثلاً کلیمنثو، لائیڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی اور مہاتما گاندھی ان سبھی میں جناح صاحب ممتاز درجے پر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کے تابناک کردار کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو انھوں نے تقریباً اپنی نا قابل فہم دور اندیشی اور مستقل مزاجی سے حاصل کیا۔ حقیقت میں قدرت نے جناح کو وکالت یا سیاست میں دوسرے نمبر کی حیثیت کے لیے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔''

کہتے ہیں کہ خزانہ ولشکر کے بغیر سلطان ہونا مشکل ہے لیکن قائد کے پاس تو نہ لشکر تھا نہ خزانہ وہ تن تنہا تھے۔ اس کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے نہ ٹینک، نہ بم نہ فوج۔ اس کے پاس نہ تو منظم قوم تھی نہ اکثریت اس قوم کے پاس نہ ہنر تھا نہ حرفت۔ نہ پریس نہ پروپیگنڈہ۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے پاکستان حاصل کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے بے سروسامانی کی حالت میں کانگریس کی دولت، پریس اور بھرپور پروپیگنڈے کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کو آزاد مملکت حاصل کر کے دی۔ کیا یہ ایک سیاسی معجزہ نہیں ہے؟

جناح صاحب نے بیشک ایک بیرسٹر کی حیثیت سے بہت سی عدالتوں میں جنگیں لڑیں اور فتح

پائی مگر سب سے بڑا اہم ترین تاریخی اور نا قابل فراموش کیس جو انھوں نے اپنی زندگی میں لڑا اور برطانیہ خواہ ہندوستان کے سبھی انگریز اور ہندو بیرسٹروں کو بری طرح شکست دی وہ تھا پاکستان کا کیس۔ مسلمانوں کی زندگی اور موت کا کیس۔ جس کیس کو دنیا کی تاریخ میں لازوال حیثیت حاصل ہوئی۔

مسٹر جناح انتہائی درجے کے خوددار انسان تھے۔ ان کے نزدیک عزت اور خودداری کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ دونوں چیزیں چلی گئیں تو باقی کیا بچا؟ وہ خودغرضی سے پاک تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ خوددار انسان زمانے میں کم ہی ہوتے ہیں۔

ایسا انسان جب سیاست میں ہو تو اس کے لیے بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس انمول سرمائے کو سلامت رکھ سکے۔ سیاسی میدان میں تو بڑے بڑے لیڈروں کو اس متاع کا سودا کرنا پڑتا ہے کیونکہ سیاست کو تو کوئلے کے بیوپار سے تشبیہہ دی جاتی ہے مگر محمد علی جناح ایسی بہت سی آلائشوں سے پاک اور عام سیاست کاروں سے بالاتر تھے۔ خوددار ہونے کے سبب ان پر یہ تہمت لگائی گئی کہ وہ مغرور تھے، ضدی تھے کسی کی بات ماننے والے نہ تھے وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کے لیے بڑے، فخر کا باعث بنے۔ جن انگریزوں اور کانگریسیوں نے مسلم قوم کو ذلیل کرنا چاہا ان سے وہ بے شک بے پرواہی سے پیش آتے تھے اور خصوصاً کانگریس کے ایجنٹوں اور حاشیہ برداروں سے تو وہ بات کرنا اور ہاتھ ملانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ بیشک وہ مخالفوں کے مقابل اپنی شان رکھتے تھے۔ مگر اپنوں سے بے حد پیار اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ ان کے ارادے بھی بلند اور مقصد بھی بلند۔ وہ راست باز اور صداقت پسند انسان تھے۔ بدعہد اور منافق نہ تھے۔ گفتگو میں کوئی ہیر پھیر کی اور الٹی سیدھی بات ہی نہ کرتے تھے۔ ان کو نہ گورنری کی ضرورت تھی نہ وزارت کی پرواہ اور نہ خطاب پانے کی طلب۔ یہ سب چیزیں ان کے قدموں تلے تھیں۔ جناح صاحب کو کانگریس کی طرف سے متحدہ ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش کی گئی لیکن انھوں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی تک انھوں نے مجھے سمجھا ہی نہیں، کیا میں نے یہ ساری جدوجہد وزارتِ عظمیٰ کے لیے کی ہے؟''

بھلا ایسا انسان جو کسی بھی قیمت پر خریدا نہ جا سکے اور جو کسی بھی طاقت سے مرعوب نہ ہو، وہ خوددار کیوں نہ ہوگا؟ ان کو کیا ضرورت پڑی تھی جو کسی کی خوشامد کرتے؟ باقی رہا ان پر مغرور ہونے

کا الزام وہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ اگر وہ مغرور ہوتے تو کس طرح دس کروڑ مسلمانوں کے واحد نمائندہ اور ہیرو ہو سکتے تھے۔

جناح صاحب مسلم لیگ کے قائد تھے، دس کروڑ مسلمانوں کو ان پر اعتماد تھا۔ کانگریس کی غلامی سے انھوں نے مسلمانوں کو کس طرح آزاد کرایا۔ مسلم لیگ میں کتنے ہی دوسرے لیڈر بھی موجود تھے مگر بقول پنڈت نہرو، دوسرے مسلم لیگی رہنما ان کی سطح سے بہت نیچے تھے جبکہ اپنی پارٹی میں وہ تن تنہا ایک دیو قامت سیاستداں تھے:

من مثالِ لالۂ صحرا ستم

(میں بیاباں میں گلِ لالہ کی مثال ہوں)

حقیقت میں جن پارٹیوں اور ان کے اخباروں نے مسٹر جناح کے خلاف تہمت لگائی، فرعون تو ان میں تھے۔ یہ نامناسب نہ ہوگا اگر چین کے عظیم انقلابی رہنما وزیر اعظم چواین لائی کے تاثرات پنڈت نہرو کے متعلق عرض کرتا چلوں:

''میں خروشیف سے ملا ہوں، چیانگ کائی شیک سے ملا ہوں، امریکی جنرلوں سے ملاقات کی ہے مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں نے نہرو سے زیادہ مغرور کسی کو بھی نہیں دیکھا یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔'':

میں الزام ان کو دیتا تھا
قصور اپنا نکل آیا

مخالف بھی مسٹر جناح کے عزم سے انکاری نہیں ہیں مگر کئی اپنے مسلمان اس سیاسی آفتابِ عالمتاب کے نور سے محروم ہیں قیام پاکستان کے وقت وہ ۷۱ سال کے کمزور اور شدید بیمار انسان تھے انھوں نے زندگی کے پچھلے چالیس برسوں میں روزانہ چودہ گھنٹے کام کیا تھا۔ ڈاکٹر روکتے تھے کہ اتنا کام کرنے سے زندگی کو خطرہ لاحق ہے پر مسٹر جناح نے مسلمانوں کے کاز کو اپنی زندگی سے زیادہ قیمتی تصور کرتے ہوئے اپنا خونِ جگر اس بوٹے کی آبیاری کے لیے دیا اور اپنی زندگی کو قوم و ملک کے حوالے کر دیا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کے پاس باصلاحیت سیاستدانوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی کانگریس ایک انتہائی منظم، مضبوط اور لامحدود وسائل والی پارٹی تھی جس میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، سوبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد، سردار ولب بھائی پٹیل، راج

گو پال آچاریہ اور صفِ اول کے کئی دوسرے لیڈر موجود تھے جو آپس میں کام تقسیم کر لیتے تھے اور ان کی تنظیم نہ صرف ملک کے اندر ہوئی بلکہ ہندوستان کے باہر بھی انھوں نے اپنا جال پھیلایا ہوا تھا۔ کانگریس کو بے پناہ مالی مدد ہندوستان کے ٹاٹا، برلاء، بجاج اور ڈالمیا جیسے ارب پتی صنعت کاروں سے مل رہی تھی کیونکہ ان سرمایہ داروں کو یقین تھا کہ حکومت آخر کار کانگریس کی ہونی ہے۔ مسلم لیگ اور مسلم قوم کا وجود تو برائے نام رہ گیا ہے۔ یہ تھیں وہ پرآشوب سیاسی حالتیں جن کے ہوتے ہوئے 'لالۂ صحرا' کو تنِ تنہا عظیم جدوجہد کا آغاز کرنا پڑا۔ اپنے اللہ پاک پر توکل اور مضبوط ارادوں اور صلاحیتوں پر بھروسا، یہی تھے اس کے ہتھیار۔

جناح صاحب نے یہ کبھی نہ چاہا کہ ہندوستان کی تقسیم ہو۔ ۱۹۳۷ء کی شروعات تک انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے باوجود قائد نے ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو کیبنٹ مشن پلان کے مطابق حل کرنا چاہا جس میں ہندوستان کو تقسیم کرنا نہیں تھا یہ متحدہ ہندوستان کا پلان کئی مسلم لیگی لیڈروں کی مخالفت کے باوجود قائداعظم نے مسلم لیگ کونسل سے پاس کرایا مگر اس پلان کا کانگریس نے بیڑا غرق کر دیا۔ پہلے اسے قبول کیا بعد میں اس سے پھر گئی جس کی تصدیق کانگریس کے بڑے لیڈر اور صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب India Wins Freedom میں کی ہے۔ یہ حقیقت جو کہ سورج کی طرح روشن ہے اس کو پس پشت ڈالنا اور چھپانا نادانی ہے۔ جناح صاحب کا دل تعصب سے بالکل آزاد، صاف اور پاک تھا۔ دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے سچے قوم پرست رہنما مسٹر جناح کے بزرگ دوست اور لیڈر تھے جن کے نقش قدم پر وہ چل رہے تھے اور کہتے تھے ''میں مسلمانوں کا گوکھلے ہونا چاہتا ہوں۔'' خود بال گنگا دھر تلک ان کے دوست تھے۔ ایسا انسان کبھی بھی ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو آمادہ نہ ہو سکا پر مصیبت یہ تھی کہ کانگریس کی بالائی قوم پرست لیڈر شپ ۱۹۲۰ء میں فوت ہو چکی تھی پھر کانگریس کی قیادت ایسے ہاتھوں میں آئی جنھوں نے 'رام راج' قائم کرنے کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ مسٹر جناح نے ایسی لیڈر شپ کی شدومد سے مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم پرستی کے بھیس میں ہندوستان پر ہندو تسلط چھا جائے جس کی گواہی ہر تحریر، ہر تصنیف اور زبان و قلم دے رہی تھی۔ جناح کا صرف یہ گناہ تھا کہ وہ سب کے لیے ایک جیسی آزادی چاہتے تھے وہ مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں تیسرے

درجے کا شہری دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے ہندوستان کی تقسیم کی ذمہ داری سو فیصدی کانگریس کے سر ہے جو مسلمانوں کو سانس لینے جیسی جگہ دینے کے لیے بھی آمادہ نہ ہو سکی تھی۔ گاندھی جی نے رام راج والے اعلان سے ہندوستان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر چھوڑا تھا:

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

(اے بادِ صبا! یہ سب باتیں تجھ پر آتی ہیں)

وہ مسلمان جس کے دل و دماغ تعصب سے بھرے ہوں وہ ایک بد بخت انسان ہے۔ اسلام میں تعصب کی گندگی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہے۔ ایک مسلمان کو وہی رستہ اختیار کرنا ہے جو انسان کے خالق کا طریقہ ہے اور وہ رب العالمین ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ:

بنی آدم اعضائے یک دیگراند

(تمام انسان ایک دوسرے کے اعضاء ہیں)

ساری انسان ذات ایک جسم کی طرح ہے اور ایک عضو کو اگر تکلیف پہنچتی ہے تو سارے جسم میں خلش محسوس ہوتی ہے اسلام نے کالے گورے اور عربی و عجمی کے سب فرق و امتیاز مٹا دیئے تھے۔ بس ایک مسلمان کے لیے وہ راستہ کھلا ہوا ہے جو اللہ پاک کا ہے:

بندۂ حق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

(اللہ کا بندہ اللہ والا راستہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی کافر ہو یا مومن وہ دونوں پر مہربان رہتا ہے)

۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی کے ایوان میں قائداعظم نے جو تقریر کی تھی وہ ان پر لگائی جانے والی تہمتوں کا مکمل جواب تھی اور لادینی (Secular) اسٹیٹ کے بانیوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھی۔ انڈیا میں رام راجیہ اسٹیٹ کو ہی سیکولر اسٹیٹ کہا جاتا ہے وہاں مغربی سیکولرزم کا تصور بھی کوئی نہیں قائد نے اپنی تقریر میں کہا:

''اب ہمیں یہی تصور اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور تم دیکھو گے کہ کچھ عرصے بعد ہندو، ہندو نہ رہیں گے۔ مسلمان، مسلمان نہ رہیں گے۔ میرا مطلب ہے سیاسی لحاظ سے، باقی مذہبی نقطۂ نظر سے ہر ایک کا اپنا مذہب ہے۔ کیونکہ یہ اس کا ذاتی عقیدہ ہے۔''

۱۱، اگست کی تقریر ہی میں قائداعظم نے قومی امراض کی صاف صاف نشاندہی کی ہے اور ان کا علاج بھی بتایا ہے پر موت نے ان کو مہلت نہ دی جوان امراض کی بیخ کنی کرتے۔ اگر پاکستان میں پاکستانی قوم کا بول بالا کرنا ہے، جدا جدا فرقوں کو متحد کرنا اور وطن عزیز کو ترقی پر پہنچانا ہے تو قائد اعظم کی ۱۱، اگست والی تجویز کردہ راہ پر چلنا ہوگا، ورنہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں۔ بد قسمتی سے ان کے جانشین وہ بنے جنھوں نے خرابیوں کا علاج نہیں کیا بلکہ بڑھ کر ان خرابیوں میں خود ہی مبتلا ہو گئے:

ڏئي ڏنڀ ياڻان ڏيل نہ ڪريو

ایک ساقی کے نہ ہونے سے ہم کیا سے کیا ہو گئے۔ بھرے پرے سر سبز و شاداب پاکستان کی باگیں غلط آدمی کے ہاتھوں میں آ گئیں اور ملک ڈانوا ڈول ہو گیا:

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں اور پھر میخانہ خالی ہے

قائداعظم کے خلاف پروپیگنڈے کے دفتر کالے کیے گئے ہیں کہ وہ سندھیوں کے خیر خواہ نہ تھے یہ سراسر بے انصافی ہے۔ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا ہے۔ قائد سندھی تھے۔ سندھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ہی تعلیم پائی تھی۔ ان کو سندھ کی سرزمین سے محبت تھی لیکن وہ سندھ کے نادان دوست نہ تھے۔ وہ سچ کہنے والے، حقائق سے واقف، جذبات اور نعرہ بازی کی سیاست سے دور ایک دور اندیش سندھ کے سپوت تھے۔ سندھ میں پہلا مسلم کالج انھوں نے قائم کرایا۔ سندھ کو بمبئی سے جدا کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کو سندھ کے تعلیمی اداروں کا احساس تھا جس کا احوال سندھ کے باب میں مفصل بیان کیا ہے بہر حال ان کو وقت نے مہلت نہ دی۔ ان کے لیے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کیسے پاکستان کو بچائیں جس کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو چھ ماہ کے اندر تباہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ پاکستان اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا آخر قائد نے جان پر کھیل کر پاکستان کی جان بچائی اور بذاتِ خود خالق حقیقی سے جا ملے۔

سیاست میں ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ کسی کو حمایت کرنے اور کسی کی مخالفت کرنے کا حق بھی ہر انسان کو ہے مگر جناح کے مخالف تو اخلاق اور انسانیت کی حدیں بھی پار کر گئے۔ ان کے خلاف کافرِ اعظم کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ ان کو آزادی اور ہندوستان کا دشمن قرار دیا گیا اور انگریزوں کا ایجنٹ بتایا گیا حالانکہ وہ پوری طرح جانتے تھے کہ یہ تہمتیں سب غلط اور جھوٹی

تھیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان والوں نے گاندھی اور نہرو کی کتنی ہی فلمیں بنوائیں جن میں تاریخ کو مسخ کرنے اور جناح کی کردار کشی کی کوشش کی گئی اور ان فلموں کی نمائش نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، ایشیاء، یورپ اور امریکہ میں بھی کرائی گئی۔ پروپیگنڈہ میں جرمنی کا گوبلز خواہ مخواہ بدنام ہے ورنہ بھارتی اس فن میں سبھی کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

خیر ان پر ہمارا کیا زور وہ تو بدیسی ہیں، غیر ہیں لیکن آج تک ہمارے اپنوں نے کیا کیا ہے؟ جب ہندوستانیوں نے اپنے رہنماؤں کی تعریف کی تو ان میں کیا کیا خطائیں نہ تھیں؟ ہندوستان کا ایک وفد ادھر آیا ہوا تھا۔ میں نے وفد کے اراکین سے پوچھا کہ کیا ہندوستان میں آئندہ نسل ان شخصیتوں کو بھول نہ جائے گی جنھوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کیونکہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت والے نظام ونصاب میں ان عظیم شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا ہر جگہ ذکر موجود ہے۔'' یہ مناسب جواب تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔

مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی تحریر کے مطابق:

> ''مسٹر جناح پاک وہند کے کامیاب سیاسی لیڈروں میں یکتا تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر مستند کتاب لکھنے کے لیے نہ حکومت کی طرف سے کوشش کی گئی ہے جو ان کی محنت اور کوشش سے وجود میں آئے۔ نہ اہل قلم نے اس طرف پوری توجہ دی ہے حالانکہ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے ان کا مزار تعمیر کرایا گیا ہے۔''

شاہ صاحب نے یہ کلمۂ حق ۱۹۶۷ء میں ادا کیا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء کے آخر تک قائد کے قریبی ساتھی رہے تھے اور حکومت کی اس غلط اور بے رخی والی پالیسی پر ان کو افسوس ہوا پر شاہ صاحب کی تنبیہ کے بعد بھی ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔ کوئی خاص فرق پھر بھی نہ آیا۔ قائد نے پاکستان حاصل کیا ان کے طفیل ہمارے حکمراں طبقے کو سب کچھ ملا۔ یہی صدر بھی ہوئے وزیراعظم بھی ہوئے وزیر سفیر بھی ہوئے۔ اعلیٰ عدالتوں کے جج اور جنرل بھی بنے۔ بڑے بڑے سول آفیسر بھی ہوئے۔ ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بھی کہلائے کارخانوں کے مالک بھی بنے مگر قائداعظم کے لیے عشر عشیر کام بھی نہ ہوا جو بھارت کے باسیوں نے اپنے محسنوں کے لیے کیا یہ کہنا

غلط نہ ہوگا کہ پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے قائد اور محسن کو جس کے طفیل وہ کرسیوں پر براجمان ہوئے بالکل فراموش کر دیا۔اس میں ان کا اپنا نقصان ہے اور قوم کا نقصان ہے البتہ جب ۱۴، اگست یا ۲۵ دسمبر کی تاریخیں ہوتی ہیں یا عوام سے ووٹ لینا ہوتے ہیں تو پھر قائد اعظم کی یاد ستاتی ہے مگر یہ رسم استخوہاں فروشی کب تک چل سکتی ہے؟ قائد اعظم کی زندگی اور ان کے عظیم کارنامے ہمارے لیے قابل فخر ورثہ ہیں۔ ہماری تاریخ کے سنہرے اور روشن باب ہیں اور یہی ہمارے نونہالوں اور نوجوانوں کے لیے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بننا چاہئیں۔ ہماری سندھ حکومت نے تو اس سلسلے میں اپنا صفحہ صاف ہی رکھا ہے۔ انگریزی اور اردو میں تو کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں پر افسوس کہ سندھ سے ابھرنے والے آفتاب سیاست کی زندگی پر کسی بھی حکومت نے سندھی زبان میں ان کی شایانِ شان کوئی سوانح لکھوانے کے لیے کوئی بھی کوشش تو درکنار اس بارے میں سوچا بھی نہیں۔ باقی جو سخاوت پہ آئیں تو ترکِ شیرازی، کے ایک کالے تل پر سندھ کو ہی قربان کر دیں۔

میں نہ تاریخ داں ہوں نہ سیاست کار نہ عالم نہ ادیب نہ کوئی اہل قلم۔ میرے پاس نہ اتنے وسائل نہ وقت بس گردش ایام کے ساتھ چلتا رہا ہوں اتنا ضرور ہے کہ پاکستان تحریک کا ایک ادنیٰ ورکر اور قائد اعظم کا سپاہی رہا ہوں۔ سیاسی کشمکش اور جدو جہد کا وہ زمانہ بھی دیکھا۔ شاگرد کی حیثیت سے سندھ کے کالجوں میں برادرانِ وطن کے متعصبانہ طرزِ عمل سے بھی واقفیت ملی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گیا تو اُدھر ذہنی اور سیاسی گھٹن سے نجات پائی۔ وہاں کے اعلیٰ علمی اور سیاسی ماحول سے بھی آشنا ہوا۔ کالج والا زمانہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک رہا۔ پاکستان قائم ہوئے آدھی صدی گزر چکی ہے مگر سندھی زبان میں قائد اعظم محمد علی جناح کی حیات، اصول پرستی، اعلیٰ تدبر اور عظیم جدو جہد کے متعلق کوئی بھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے قائد اعظم ہمارے لیے ابر رحمت بن کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر ہماری ڈوبتی کشتی کو بیچ بھنور سے نکال کر کنارے سے لگایا ورنہ ہم تو گرداب کے چنگل میں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قائد کا ہم پر قرض ہے اور میرا فرض ہے کہ اپنی بساط کے مطابق ان کی زندگی کے متعلق ٹوٹے پھوٹے قلم سے احوال واقعی عرض کروں اور ان کی سیاست کے تاریخی پہلوؤں کو پیش کروں جو اکثر عوام سے پوشیدہ ہی رہے ہیں حالانکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مختصر کتاب میں اتنی اہم شخصیت اور اتنے اہم موضوع سے شاید انصاف نہ کرسکوں

وہ موضوع جو ہندوستانی سیاست کی نصف صدی پر محیط تھا:

آغشتہ ایم بر سر خارے بخونِ دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

(اپنے دل کے لہو سے ہر ایک کانٹے کی نوک کو سیراب کر رہا ہوں تا کہ بیاباں میں باغبانی کے قانون کو تحریر کر دوں)

نوٹ:

جناب عبدالغفور بھرگڑی ایڈوکیٹ نے بڑے خلوص اور خاصی تحقیق سے سندھ میں ایک ضخیم کتاب قائداعظم کی شخصیت اور کارناموں پر پیش کی ہے جس کا ترجمہ سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے پروفیسر آفاق صدیقی کر رہے ہیں۔ یہ پہلا باب اسی کتاب کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ (ج۔ن)

◆◆◆

maablib.org

# قائدِاعظم اور سرسیّد کا تصورِ حب الوطنی

ظلِ احمد نظامی

قائداعظم 1876ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سال سرسید احمد خاں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر کے علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ایک سال پہلے قائم کیے گئے اپنے عظیم ادارے کے امور پر توجہ دے سکیں۔ نوجوان جناح نے جب اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کا فیصلہ کیا اور اس وقت تک برصغیر کے دور اُفتادہ مغربی ساحلی علاقوں میں علیگڑھ کا پیغام عام نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قائد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن جانے کا فیصلہ کیا تاہم برصغیر کی سیاست میں شمولیت کے بعد انہیں سرسید احمد خاں کے عظیم منصوبہ کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس کے بعد وہ تادمِ حیات علیگڑھ یونیورسٹی اور اس کے بانی کے مداح رہے۔

سرسید اور قائداعظم کی فکر، ذہنی رجحان، جذبۂ حب الوطنی میں حیرت انگیز طور پر مماثلت پائی جاتی تھی۔ یہ دونوں رہنما اپنی یکساں غیر معمولی اخلاقی جرأت مسلسل کام کرنے کی جناتی صلاحیت اور بے پناہ قوتِ ارادی سے مسلمانوں کی بہبودی اور ترقی کے لیے جہاد کرنے کی خاطر برصغیر کے مسلمانوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔

امپیریل لی جس لیٹو کونسل میں اپنی نامزدگی کے بعد سرسید نے مسلمانوں کے لیے وقف قائم کرنے کے لیے ایک بل پیش کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی۔ مذکورہ بل کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے اہلِ خانہ، اولاد اور ورثا کے لیے وقف کرنے کا اختیار دیا جانا تجویز کیا گیا تھا۔ قائداعظم نے 1910ء میں کونسل کا رکن منتخب ہونے کے بعد سرسید کے محولہ بل سے متاثر ہو کر ان ہی خطوط پر کامیابی کے ساتھ ایک بل پیش کیا جس کی رو سے مسلمانوں کو اپنی جائیداد اور املاک وقف کرنے کا اختیار مل گیا۔

قائداعظم نے سرسید کے دوقومی نظریہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا جو بالآخر قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔ قائداعظم کو بخوبی احساس تھا کہ 1906ء میں قائم کی گئی آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی اراکین آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے بھی فعال اراکین میں شامل تھے اس لیے مسلم لیگ کے قیام میں سرسید اور ان کے معتمد ساتھی اس تنظیم کے قیام کے حوالے سے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ تحریکِ پاکستان میں جان ڈالنے اور کامیابی سے ہم کنار کرنے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی مسلسل اور انتھک کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم علیگڑھ کو مسلمانوں کا اسلحہ خانہ کہتے تھے۔ یہ ایک موقع پر قائداعظم نے فرمایا تھا۔ قائداعظم کو علیگڑھ یونیورسٹی اور اس کے طلبا سے بہت لگاؤ تھا۔ علیگڑھ اور قائد کے مابین یہ محبت دوطرفہ تھی کیونکہ علیگڑھ کے طلبا قائد کے احکامات پر سختی سے عمل کرتے اور ان کے پیغام کو عام کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ قائداعظم تواتر کے ساتھ علیگڑھ یونیورسٹی میں تشریف لاتے تھے اور بہت سے اہم اعلانات انہوں نے یونیورسٹی کے یونین ہال اور اسٹیریچی ہال ہی میں کیے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے اور ان کی رکنیت تادمِ حیات قائم رہی۔ یونیورسٹی کے یونین ہال میں قائد کا فوٹو آج بھی آویزاں ہے۔

گو قائداعظم نے خود مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ان کے بیشتر رفقائے کار اور ساتھیوں نے علیگڑھ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ تحریکِ پاکستان میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے کردار کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چھ سربراہانِ مملکت/حکومت، صوبائی گورنرز بہت سے وزرا، اراکینِ پارلیمنٹ اور مسلم لیگ کے صدر علیگڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔

علیگڑھ تحریک اور تحریکِ پاکستان اصل میں ایک ہی فکر کے دو نام تھے۔ سرآغا خاں نے اس بات کی کچھ اس طرح وضاحت کی:

> ''پاکستان کی آزاد اور خودمختار قوم کی پیدائش علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔''
>
> مسلمانوں کی ان دو عظیم اور دیوقامت شخصیتوں کی کوششوں کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے کہا تھا کہ ''ان کے (سرسید) رویہ میں نظریۂ پاکستان جھلکتا تھا۔ بس انگریز کے جانے کی دیر تھی جو اس زمانے میں بہت دور کی بات تھی۔ سرسید کا رویہ جن کے یقین میں پروان چڑھا اور نظریۂ پاکستان حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔''

مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں کی گئی قائداعظم کی تقریروں کی گونج آج بھی یونیورسٹی

کے قدیم طلبا کے کانوں میں محفوظ ہے۔ایسی ہی تقریروں میں ایک بار آپ نے فرمایا تھا:

''پاکستان ہماری نجات، ہمارا دفاع اور مقدر ہے۔ہم ہندوؤں اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بننے پر تیار نہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان جغرافیائی حدود اور غلامی کی زنجیروں کے سوا کوئی چیز مشترکہ نہیں، ان میں سے کسی بھی عنصر پر مبنی قومیت لایعنی اور غیر فطری ہوگی اور ایسی قومیت نہ تو قائم ہوسکتی ہے اور نہ ہی قائم رہ سکتی ہے۔ہم خوددار لوگ ہیں اور اپنے حقوق کی طرح دو کے عقیدہ پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے کسی کو پاکستان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک اور موقع پر علیگڑھ کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے اعلان کیا۔

''ہم اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔'' آپ نے آگے چل کر فرمایا:''دس کروڑ انسانوں کی یہ قوم جرمنوں سے بڑی قوم ہے اور اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی تہذیب و ثقافت منفرد ہے۔زبان و ادب، فن و تعمیرات، قوانین و اخلاقیات، لباس، غذا، کلینڈر، میلے اور تہوار، تاریخ و رسوم، فکری رجحانات اور عزائم کے اعتبار سے ہم ایک الگ قوم ہیں۔مختصر یہ کہ ہم زندگی کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں۔بین الاقوامی قوانین کے تمام ضابطوں کی رو سے ہم ایک قوم ہیں۔''

تحریکِ پاکستان کے دورِ عروج میں کانگریسی راہنما سردار پٹیل نے کہا تھا کہ تعلیم کی صورت میں طویل خانہ جنگی شروع ہوسکتی ہے۔مذکورہ بیان کے حوالے سے قائداعظم نے یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''طویل خانہ جنگی کے اشارے کو ہم رد کرتے ہیں۔ہم اپنے تئیں خانہ جنگی نہیں چاہتے لیکن اگر یہ ہم پر تھوپی گئی تو دس کروڑ انسانوں کی یہ قوم عزم و استقلال کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے گی۔ہم حقِ خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ایسی مکمل خودمختاری جس کی رو سے ہم اپنے خطۂ زمین پر انگریزوں یا ہندوؤں کی مداخلت کے بغیر لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق قوانین وضع کرسکیں۔پاکستان ہمارا واحد مطالبہ ہے، تاریخی اعتبار سے ہمارا ہر مطالبہ جائزہ ہے۔یہ انصاف کا تقاضا بھی ہے

اور ہمارا حق بھی۔اس کے لیے ہماری آنے والی نسلیں منتظر ہیں۔خدا کی قسم ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے۔"

مسلم اینگلواورینٹل کالج کو یونیورسٹی کی سطح پر لانے میں قائداعظم نے بہت اہم کردارادا کیا۔ اور 12-1911ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے گراں قدر عطیہ دیا۔یونیورسٹی کے قیام کے لیے فنڈ جمع کرنے کے لیے جو کمیٹی قائم کی گئی تھی اس میں آغاخاں کے ساتھ قائداعظم بھی شامل تھے۔مذکورہ صدی کے پہلے عشرے میں قائداعظم ان راہنماؤں کے ہم نوا تھے جو علیگڑھ کو مسلمانوں کی تعلیم اور سیاست کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔1910ء تک علیگڑھ آل انڈیا مسلم لیگ کا ہیڈکوارٹرز رہا، تاہم بعد میں یوپی میں اس وقت کے گورنر سرجون ہیوٹ ( Sir John Hewett) کی مداخلت کے نتیجے میں مسلم لیگ کا مرکز علیگڑھ سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔مرکز کی تبدیلی کو علیگڑھ تحریک پر ضرب کاری تصور کیا گیا اور یہ تبدیلی قائداعظم کو بھی پسند نہ آئی لیکن مستقبل کے حالات سے ثابت ہوا کہ ہیڈکوارٹرز کی تبدیلی سے تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑا اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی حسبِ سابق مسلم سیاست میں اہم کردار انجام دیتی رہی اور بالآخر 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

1915ء میں قائداعظم کو ایم اے او کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا گیا اور وہ اس ادارے کی کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں مصروف رہے۔حتیٰ کہ 1920ء میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ تحریکِ خلافت کے دوران گاندھی اور ان کے ساتھیوں کی یہ کوشش تھی کہ یونیورسٹی کو بند کر دیا جائے لیکن قائداعظم نے اپنے دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کے تعاون سے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔یونیورسٹی کے قیام کے بعد قائداعظم یونیورسٹی کورٹ کے رکن مقرر کیے گئے اور انہوں نے دسمبر 1925ء میں یونیورسٹی کی جوبلی تقریبات کا انعقاد ہوا۔مذکورہ تقریبات میں ایک مذاکرہ بھی شامل تھا جس کا موضوع تھا: "یہ وہ وقت ہے جب ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم ہونا چاہیے۔" اس مذاکرے میں قائداعظم نے بھی شرکت فرمائی۔قائداعظم کی شدید خواہش تھی کہ علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبا کو سول سروس اور مسلح افواج میں ذمے دار عہدوں پر تعینات کیا جائے۔وہ اس مسئلے پر اس قدر سنجیدہ تھے کہ انہوں نے ڈاکٹر سرضیاءالدین احمد کے ساتھ اس کمیٹی کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا جو برطانوی حکومت نے سانڈھرسٹ (Sandhurst) کے

طرز پر دہرہ دون میں ملٹری ٹریننگ کالج کے قیام کے لیے بنائی تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب علیگڑھ یونیورسٹی آفیسر ٹریننگ کورس (UOTC) کا قیام عمل میں آیا جس کے توسط سے علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو برطانوی فوج میں شامل ہونے کے مواقع فراہم ہوئے۔ جو طلبا اس وقت برطانوی فوج سے وابستہ ہوئے قیامِ پاکستان کے بعد ان میں سے اکثر پاکستانی فوج میں ذمے داروں عہدوں پر فائز ہوئے۔

اسی دوران قائداعظم نے یونیورسٹی میں اقامتی سہولتوں پر توجہ دیتے ہوئے ''سر شاہ سلیمان ہال'' کی تعمیر کے لیے ایک معتد بہ رقم فراہم کی۔ محولہ بالا ہال میں ان دنوں انجینئر نگ کے طلبا اقامت پذیر ہیں۔

1928ء میں قائم ہونے والے اس ہال میں قائداعظم عطیہ کی تختی آج بھی موجود ہے۔

1930ء کے عشرہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے قائداعظم نے اور بھی زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ 1936ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے رضا کاروں سے پانچ لاکھ روپے جمع کرنے کی اپیل کی جسے وہ چاندی کی گولیاں کہا کرتے تھے۔ یونیورسٹی یونین کی درخواست پر قائداعظم نے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یونیورسٹی کے ایک فعال طالبِ علم محمد نعمان 1936-37ء میں قائم ہونے والی اس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ فیڈریشن کے قیام کے بعد یونین ہال میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ کانگریس مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہی۔ دراصل وہ اپنے کانگریسی آقاؤں کی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پر عمل کر رہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے جھانسے میں نہ آئیے۔

جنوری 1938ء میں قائداعظم جب علیگڑھ تشریف لائے تو ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے یونیورسٹی کیمپ تک تین میل کا فاصلہ تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا قائداعظم کی سواری خود کھینچ کر لائے۔ اس موقع پر کی گئی ایک یادگار تقریر میں گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں پر محیط مسلمانوں کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل کرنے پر زور دیا۔

23/ مارچ 1940ء کو پیش کی جانے والی قراردادِ پاکستان سے سترہ دن قبل قائداعظم

تشریف لائے تا کہ وہ طلبا کو مجوزہ تاریخ ساز فیصلے سے آگاہ کر سکیں۔قائداعظم کی دعوت پر جناب افضال حسین قادری کی قیادت میں شرکت کی۔اس موقع پر جب طلبا نے قائداعظم کو دوبارہ علیگڑھ آنے کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا:''ہاں! میں علیگڑھ کی زیارت کے لیے ضرور آؤں گا۔''

قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد جب قائداعظم علیگڑھ میں تشریف لائے تو طلبا کی مہمان نوازی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔''آپ لوگوں کے استقبالیہ میں شرکت کے بعد میں عمر میں دس سال چھوٹا محسوس کر رہا ہوں۔

قائداعظم اہم فیصلوں کا اعلان اکثر علیگڑھ میں کیا کرتے تھے۔ 1941ء میں یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے اتحاد، یقین اور تنظیم کا معروف سلوگن دیا۔قائداعظم کی ہدایت کے مطابق یونیورسٹی یونین اپنی کارکردگی کی رپورٹ باقاعدگی سے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری کو ارسال کرتی تھی۔ 17رجنوری 1941ء کو جب قائداعظم کو یہ اطلاع دی گئی کہ یونیورسٹی یونین نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کی قرارداد منظور کی ہے تو انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔

علیگڑھ یونیورسٹی سے بے انتہا اُنسیت کے باوجود قائداعظم نے اعزازی ڈگری یا کوئی اور اعزاز حاصل کرنے پر آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے 3رستمبر 1942ء کو لکھے جانے والے ایک مراسلے میں قائداعظم کو مطلع کیا گیا کہ یونیورسٹی کورٹ نے انہیں ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے مراسلے کے جواب میں قائداعظم نے لکھا: میں انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے سادگی کے ساتھ صرف مسٹر جناح کی حیثیت میں زندگی گزاری ہے اور میں صرف مسٹر جناح کی حیثیت میں ہی مرنا چاہتا ہوں میں اس قسم کے خطابات یا اعزازات کا مخالف ہوں اور مجھے خوشی ہوگی کہ مرے نام کے ساتھ کوئی لاحقہ شامل نہ کیا جائے۔اس لیے مجھے اُمید ہے کہ کورٹ میرے احساسات و جذبات کی روشنی میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے گی حالاں کہ مجھے بخوبی احساس ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے مسلم یونیورسٹی کے ''اعزاز'' سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز نہیں ہوسکتا۔

کانگریس کے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے نعرے کے جواب میں قائداعظم علیگڑھ یونین ہال میں پہلی مرتبہ ''تقسیم کرو اور ہندوستان چھوڑ دو'' کا جوابی نعرہ لگایا۔2ردسمبر 1942ء کو یونیورسٹی کے دورہ کے موقع پر قائداعظم کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔اس موقع پر یونیورسٹی کے وائس

چانسلر پروفیسر اے بی اے علیم نے قائد کی کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''قائداعظم میرے اور آپ کے درمیان ایک چیز مشترک ہے میں آج کل تاریخ پڑھا رہا ہوں جب کہ آپ تاریخ بنا رہے ہیں۔''

1943ء میں اسٹریچی ہال میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''مسلمان قوم کے نوجوانو! میں آپ لوگوں کو تلواروں اور رائفلوں سے لیس ایسے سپاہیوں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں جو آزادی کی منزل پر رواں دواں ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ہمیشہ کے لیے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آزادی حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اگر آپ نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔ لوہا جب گرم ہو تو ضرب لگانا چاہیے۔ میرے احکام کے منتظر رہیے اور آگے بڑھیے۔''

مسلم یونیورسٹی کی طالبات نے مسلم خواتین کے لیے جب قائداعظم کا پیغام حاصل کرنے کی خواہش پر 10/مارچ 1944ء کو یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ دنیا کی کوئی قوم اپنی خواتین کو شریک کار بنائے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ ہم بری رسموں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ قیدیوں کی طرح عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں مقید رکھنا خلافِ انسانیت ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کو اپنائیں لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم اسلامی نظریات اور ضابطوں کے مطابق اپنی عورتوں کا مرتبہ بلند کریں جن حالات میں ہماری خواتین زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ان کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی معاشرہ کی غلط اور گندی روایات سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی خواتین کو ساتھ لے کر چلیے۔ آپ ناخواندہ خواتین سے اپنے بچوں کی صحیح پرورش کی کیسے توقع کر سکتے ہیں۔ عورت بچوں کی صحیح خطوط پر پرورش کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ ہمیں اس سرمایہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

1945-46ء کے فیصلہ کن انتخابات کے موقع پر قائداعظم نے مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے لیے خصوصی پیغام بھیجا۔ جس میں انہیں مسلم لیگی اُمیدواروں کے لیے دل جمعی سے کام کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ 2/نومبر 1945ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ذریعہ بھیجے گئے اس پیغام میں آپ نے فرمایا تھا کہ بہتر اور سنہری مستقبل کے لیے ایک تعلیمی سال کی قربانی دینے میں کوئی

مضائقہ نہیں۔ قائداعظم کے حکم کی تعمیل میں مسلم یونیورسٹی کے طلبا جوق در جوق برصغیر کے کونے کونے میں پھیل گئے اور مسلم لیگی اُمیدواروں کو کامیابی سے ہم کنار کرایا۔ مذکورہ انتخابات کے سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلبا نے جو خدمات انجام دیں وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں اور انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد علیگڑھ تو پاکستان کا حصہ نہیں بنا لیکن تحریکِ پاکستان میں علیگڑھ نے جو کردار ادا کیا وہ قوم کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ قائداعظم کو علیگڑھ سے جو اُنسیت تھی اس کا اندازہ 30 رمئی 1939ء کو بمبئی میں کی گئی ان کی وصیت کے مندرجات سے ہوسکتا ہے۔ مذکورہ وصیت کے مطابق انہوں نے اپنی چھوڑی ہوئی جائیداد کو تین حصوں میں تقسیم کرکے مندرجہ ذیل اداروں کو دینے کا فیصلہ کیا تھا:

1۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

2۔ اسلامیہ کالج پشاور

3۔ سندھ مدرسہ، کراچی

قائداعظم کی چھوڑی ہوئی جائیداد درج ذیل ہے:

1۔ فلیگ اسٹاف ہاؤس، کراچی

2۔ ملیر (کراچی) میں دس ہزار دو سو چودہ مربع گز کا ایک پلاٹ

3۔ ہاکس بے (کراچی) میں 175 ایکڑ زمین

4۔ گلبرگ لاہور میں 10 رکنال کا ایک صنعتی قطعہ زمین

مذکورہ املاک کے علاوہ ایک معتد بر فنڈ قیامِ پاکستان کے بعد اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی نہ کرنا علیگڑھ سے ان کی بے پناہ محبت کا بھی ثبوت ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ وصیت کی گئی مذکورہ رقم مسلم یونیورسٹی کو بھی فراہم نہ کی گئی اور یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ علیگڑھ کی 117 رسالہ تاریخ میں نظام دکن کے سوا قائداعظم سے بڑھ کر اتنی خطیر رقم یونیورسٹی کے لیے کسی اور شخص نے نہیں چھوڑی۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصورِ ثقافت

پروفیسر سحر انصاری

قائداعظم محمد علی جناح ایک مدبر، ایک سیاسی دانش ور اور مستقبل کا ویژن رکھنے والے اہم قائد تھے۔ ان کی دیانت داری، خلوص اور کردار کی طاقت پر کبھی ان کے مخالفین بھی کوئی منفی رائے نہ دے سکے۔ اس وقت جو عالمی منظر نامہ تھا جس میں ایک طرف نوآبادتی نظام اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ دنیا کے اکثر حصوں پر چھایا ہوا تھا، دوسری طرف دوسری عالمی جنگ نے دنیا کے نقشے پر خوف، ہیبت اور غیر یقینی کیفیت طاری کر دی تھی۔ ادھر مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس پارٹی دونوں آزادی کی جدوجہد میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ تاہم اس سلطنت کو کہ جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ برطانوی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، اسے برطانوی تاج اتنی آسانی سے برصغیر کے باشندوں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ اس بارے میں مکمل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے کہ برصغیر کی آزادی کو ٹالنے، اس میں رخنے پیدا کرنے کے لیے کس کس طرح کے منصوبے بنائے گئے۔ لیکن قائداعظم کا یہ عزم کہ اگر ایک رومال کے برابر بھی جگہ مل جائے گی تو میں اس پر پاکستان کا جھنڈا گاڑ دوں گا، اس عزم کی نشان دہی کرتا ہے کہ تمام اُمور پر غور کرنے کے بعد وہ سختی سے اس منصوبے پر قائم رہے کہ مسلمانوں کی ایک علاحدہ مملکت ہونی چاہیے۔ قائداعظم سے بیوروے نکلس نے ایک گفتگو کے دوران دریافت کیا کہ آخر آپ ہم سے کیا مطالبہ کرتے ہیں۔ قائداعظم نے کہا Divide & Quit ادھر راج گوپال اچاریہ نے 1942ء میں اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی اور ہندوستان چھوڑ دو کے حق میں اپنی رائے دوسروں سے مختلف رکھی۔ اس وقت تک قراردادِ لاہور پیش کی جا چکی تھی اور برطانوی راج اقتدار منتقل کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ راجہ جی یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو ان کے حقِ خود اختیاری کی ضمانت دے

دی جائے تو وہ کانگریس سے اشتراک کے لیے تیار ہو جائیں گے جو چیز راجہ جی کے فارمولے کے نام سے موسوم ہے اس کے نکات یہ تھے:

(۱) مسلم لیگ ہندوستان کی جانب سے آزادی کے مطالبے کی حمایت کرے اور عبوری دور کے لیے جو عارضی حکومت تشکیل دی جائے اس میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے۔

(۲) جنگ کے خاتمے کے بعد کانگریس شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان کے ان اضلاع کے لیے جہاں مسلم آبادی کی اکثریت ہے حد بندی کے لیے کمیشن مقرر کرے۔

(۳) ایسے علاقوں کی حد بندی کے سلسلے میں بالغ رائے دہی یا اسی قسم کے کسی متبادل طریقے کے ذریعے استصوابِ رائے کیا جائے اور ہندوستان سے علاحدگی کے مسئلے کو طے کرے۔ اگر اکثریت ہندوستان سے الگ ریاست بنانے کا فیصلہ کرے تو اس پر عمل کیا جائے۔

(۴) علاحدگی کی صورت میں دفع، تجارت، مواصلات اور دیگر لازمی اُمور میں باہمی رضامندی سے کام کیا جائے گا۔

(۵) اگر برطانیہ مکمل اختیار اور ذمے داری ہندوستان کے سپرد کردے تب یہ شرائط کی پابندی لازمی ہوگی۔

قائداعظم نے ان نکات پر غور کر کے ان کو منظور کرنے سے معذرت کرلی اور ان کا وہ مشہور فقرہ ایک تقریر میں سامنے آیا کہ اس طرح ایک پرچھائیں، ایک بھونسہ مسخ شدہ اور کرم خردہ پاکستان ملے گا۔'' اس کے بعد کوشش گاندھی جی نے بھی کی کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ صدیوں کی تاریخ کے پس منظر میں ہندو مسلم ایک ہی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ لیکن قائداعظم نے دوٹوک الفاظ میں یہ واضح کردیا کہ مسلمانوں کی ثقافت ہر لحاظ سے ہندو ثقافت سے مختلف ہے۔ گاندھی جی نے ۱۷ر جولائی ۱۹۴۴ء کو بھائی جناح کے القاب کے ساتھ گجراتی زبان میں ایک خط لکھا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں اپنی مادری زبان میں آپ سے مخاطب ہوں اور یہ بھی یقین دلایا کہ مجھے اسلام یا ہندوستانی مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھا جائے۔ میں ہمیشہ آپ کا اور انسانیت کا خادم رہا ہوں۔

قائداعظم سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ اگر آپ کو علاحدہ مملکت مل جائے تو ہندو، سکھ اور عیسائی اقلیتوں کے ساتھ آپ کا کیا برتاؤ ہوگا تو جناح صاحب نے جواب دیا کہ یہ سب اس ملک کے

شہری اور ہماری پوری اجتماعی زندگی کا حصہ ہوں گے۔

قائداعظم نے واضح الفاظ میں گاندھی جی کو ایک خط لکھ کر اپنے تصورِ ثقافت کو واضح طور پر پیش کیا اور یہ بتایا کہ ہماری تاریخ، ہمارے نام، ہماری عبادت کے طریقے یہ سب ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں اور قوم کی تعریف جس طرح بھی کی گئی ہے اس کے اعتبار سے ہم ایک قوم ہیں۔

قومی ثقافت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قوم کا تعین ہو جائے۔ اس وقت گاندھی جی اور دیگر لیڈروں نے قومیت اور ثقافت کے بارے میں ذہنوں کو دھندلا اور غیر شفاف کرنے کی کوشش کی۔ قائداعظم نے ثقافت کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے گاندھی جی کے نام ایک خط میں واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا کہ بین الاقوامی قانون کی تمام شرائط کی رو سے ہم ایک قوم ہیں:

"We maintain and hold that Muslims and Hindusare two major nations by any definition or test of a nation. W are a nation of a hundred million, and what is more, we are a nation with our own distinctive culture and civilization, language and literature, art and architectur, names and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and calendar, history and traditions, aptitudes and ambitions, in short we have our own distinctive outlook on life and of life. By all canons ofinternational law we are a nation."

(قائداعظم کا خط گاندھی جی کے نام مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

قائداعظم نے نہ صرف وضاحت کے ساتھ قوم اور قومی ثقافت کی تعریف کر دی ہے بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی قائداعظم کی یہ تحریر ایک ادبی اُسلوب کی حامل ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ۱۱راگست ۱۹۴۸ء کو جب قائداعظم نے تقریر کی، اس میں واضح طور پر یہ کہا کہ اب نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان ہے، سیاسی اعتبار سے ہم ایک ہیں، لیکن عقائد الگ ہیں تو ہر شخص کو اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق عبادت گاہوں میں جانے کی اجازت ہوگی۔ اسی طرح وہ یہ جانتے تھے کہ ہر آزاد قوم اور ملک میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ایک مشترک زبان (Lingua Franka) بہرحال ضروری ہوتی ہے۔ چناں چہ گاندھی جی نے جو گجراتی زبان میں خط لکھ کر قائداعظم کے ذہن کو دوسری سمت سوچنے پر مائل کرنا چاہا تھا وہ کارآمد نہ ہوا۔ چوں کہ تحریکِ آزادی میں ثقافت کے دیگر پہلوؤں کی تشریح کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کو بھی بہت اہمیت رہی ہے۔ اس لیے قائداعظم نے ڈھاکا میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ہر مقامی اور صوبائی زبان کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اپنی زبان کو جس طرح چاہے فروغ دے۔

لیکن بدقسمتی سے قائداعظم کی تقریر کے اس حصے کو منظرِ عام پر نہیں لایا جاتا اور صرف پہلے حصے کی بنیاد پر اتنی نفرتیں اور لسانی اختلاف پیدا کیے گئے کہ پاکستان کا مشرقی حصہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ قائداعظم ایک قانون دان کی حیثیت سے غیر جانب داری اور تمام انسانوں کے لیے مساوی حقوق کے قائل تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنے عمل اور اپنے قوم سے تمام زندگی کیا۔

اب جو لوگ قائداعظم کو سیکولر کہتے ہیں ان کے مخالفین سیکولر کا ترجمہ لادینیت کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ قائداعظم کے پورے فکری رویے اور ۱۱راگست کی تقریر سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تمام لسانی، مذہبی اور اجتماعی سوچ کے انداز کو آزادانہ طور پر برتنے کے قائل تھے۔ گویا وہ لادینیت کے بجائے ہمہ دینیت کے قائل تھے۔

•••

maablib.org

# قائدِاعظم کی ترجیحات اور تصورِ تعلیم

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انھوں نے برصغیر کے مختلف النوع، مختلف اللسان اور مختلف النسل مسلم آبادی کو سیاسی معنوں میں ایک قوم بنادیا اور وہ عالمی سیاست کے افق پر ایک ایسے ستارے ہیں جس نے برصغیر کی مسلم قوم کو ایک مسلم قومی وطن دیا۔ یعنی ایک جغرافیہ بھی دیا۔

میرے مقالہ میں جس نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے رہنما تھے جنھوں نے مسلم قوم کی صفاتی تبدیلی کے لیے تعلیم کو سب سے بڑا ہتھیار قرار دیا اپنے پچاس سال پر محیط سیاسی کیریئر میں ۱۰۰ سو بار سے زائد مرتبہ تعلیم، اور تعلیم بھی عصرِ جدید کی نئی ضروریات کے تقاضوں پر پورا اترنے والی تعلیم پر زور دیا۔ قائداعظم نے ایک آزاد قوم کے لیے تعلیم اور ایک نوآبادیاتی شکنجہ میں جکڑی ہوئی قوم کی تعلیم میں خطِ فاصل کھینچا اور برطانوی ہند میں رائج تعلیم کو انگریز حکمرانوں کی ضروریات کے مطابق ایک نظام قرار دیا اور سائنسی ٹیکنالوجیکل ترجیحات سے مزین تعلیم کو ایک ترقی پذیر آزاد قوم کا ملجا و ماویٰ قرار دیا۔

قائداعظم نے امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے پرائمری تعلیم کے بل پر (۱۹۱۱ء) لب کشائی کے وقت سے پاکستان کے طلباء سے متعدد مواقع پر خطاب کرتے ہوئے آزادی کے بعد کی تعلیمی ترجیحات پر دوٹوک گفتگو کی۔ قائداعظم ترقی کی ضرورت اور منطق سے آگاہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ غربت اور جہالت کا خاتمہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب پاکستان سے جہالت یکسر دور کردی جائے گی اور سماجی ترقی کے لیے درکار علوم کی روشنی سے بہرہ ور ہونے کے لیے سائنس و ٹیکنالوجی (بشمول انجینئرنگ اور بزنس ایڈمنسٹریشن) کے حصول کو اولین

ترجیح دی جائے گی۔ وہ اسلامی کلچر اور روایات کی قیمت پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نہ چاہتے تھے جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں عملاً نظر آرہا ہے۔ بلکہ وہ سوشل سائنز......اور HUMANITIES اور سائنس کے مابین اس مثالی امتزاج کے آرزومند تھے جو آج بھی ہمارے مسائل کا حل ہے۔

مقالہ میں قائداعظم کے تصور تعلیم، نو آبادیاتی اور آزاد قوم کی تعلیمی ضروریات میں بیّن فرق......اور قائداعظم کی زندگی میں منعقد ہونے والی آزاد پاکستان کی پہلی تعلیم کانفرنس میں قائد اعظم کے پیغام سے تعلیم کے بارے میں قائداعظم کے نظریات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مقالہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی (۱۹۴۳ء) کے اس مجلس قائمہ (جسے معاشی منصوبہ بندی کمیٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے انجینئر چیئر مین نواب علی نواز جنگ بہادر کی رپورٹ کا حوالہ بھی ہے جو پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی کے لیے بنیادی ترجیحات فراہم کرتی ہے۔ یہ رپورٹ بہ وجہ مصروفیات منظور نہ کی جا سکی لیکن یہ رپورٹ قائداعظم اور مسلم لیگ کے نظریات کی ایک ایسی جامع تصویر ہے جس کے ملاحظہ کے بعد یہ کہنا غلط ہوگا کہ معمارانِ پاکستان کے ذہن میں پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے کوئی جامع منصوبہ نہ تھا آج وہ منصوبہ......اور اس کے اہم رہنما اصول ہمارے سامنے ہیں ان اصولوں کی بنیاد پہ لازوال اصحل ہے کہ آزاد قوم کی تعلیم اس قوم کی تاریخ اور اس کی خود مطالعہ جاتی بصیرت سے عبارت ہونی چاہیے۔ یہ بصیرت قوم بہ قوم جدا ہوتی ہے لیکن تعلیم ترقی کے رازہائے جلی و خفی تک رسائی کا نام ہے یہ قومی زندگی کے ہر تاریخی دور میں زندہ رہنے کے اصولوں سے کامل مطابقت پیدا کرنے کا نام ہے۔

یہ قائدِ اعظم کا تعلیمی نظریہ تھا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کلیدی اہمیت حاصل تھی لیکن قومی کلچر اور تاریخ کے بارے میں بصیرت و آگہی بھی اس تعلیمی نظام کا لازمہ تھا۔

•••

maablib.org

# تصوراتِ قائدِاعظم اور سچد آنند سنہا

پروفیسر علی حیدر ملک

قائداعظم محمد علی جناح ان معدودے چند سیاسی رہنماؤں میں سے ایک ہیں جن کی زندگی میں بھی ان کے بارے میں کتابیں لکھی گئیں اوران کے انتقال کے بعد بھی یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ان کے انتقال کے فوراً بعد جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں ڈاکٹر سچد آنند سنہا کی "JINNAH - As I know him" بھی شامل ہے۔یہ دراصل انگریزی زبان میں ایک کتابچہ ہے جس کا اردو ترجمہ بہت بعد میں ہندوستان کے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر احمد یوسف نے کیااور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا۔

ڈاکٹر سچد انند سنہا (پیدائش: 1871ء۔ وفات: 1950ء) اپنے وقت کے نہایت ممتاز قانون داں، ماہر تعلیم اور سیاستداں تھے اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں، وہ 1946ء میں ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اوراس کی افتتاحی اجلاس کی صدارت بھی کی۔ یوں تو وہ ایک اردوداں لبرل دانشور تھے لیکن چونکہ ان کا تعلق بہرحال ہندوستان کی اکثریتی قوم سے تھا اور وہ کانگریس پارٹی میں بھی شامل تھے اس لیے وہ دوقومی نظریہ کے حق میں نہیں تھے۔ انھوں نے اس مسئلے پر قائداعظم سے اختلاف کیا ہے مگر ان کی شخصی خوبیوں اور صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔

ان کی مختصر سی کتاب ''وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں'' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ وہ قائداعظم کے قریبی دوستوں میں شامل تھے اور ہندوستان و انگلستان میں ان دونوں کا ساتھ رہا تھا۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائریکٹر حبیب الرحمٰن چغانی نے اردو ترجمے کے حرف آغاز میں لکھا ہے کہ......'' جناح ان کے دوست رہے تھے اور وہ بھی قریبی دوست۔انھوں نے

جس انداز میں جناح کو دیکھا یا محسوس کیا وہ اوروں سے مختلف ہے۔ یہ ان کے اپنے خیالات ہیں آپ مانیں یا نہ مانیں۔ بہر حال اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔"

ڈاکٹر سنہا نے اپنے کتابچے کی ابتداء اس طرح کی ہے:

"پچھلی صدی کے نویں عشرے کی ابتداء میں لندن میں سینکڑوں ہندوستانی طلبہ میں دو گجراتی (مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی اور مسٹر محمد علی جناح بھائی خوجانی) ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ میں اپنے نام ثبت کر دیئے ہیں ......محمد علی بھائی جناح بھائی خوجانی جو کہ بعد میں مسٹر ایم۔اے۔ جناح کے مختصر نام سے جانے گئے وہاں 1892ء میں پہنچے۔ مسٹر علی امام کو 1890ء میں پیشۂ وکالت میں نامزد کیا گیا اور مسٹر گاندھی کو 1891ء میں مجھے 1892ء میں اور مسٹر جناح کو 1897ء میں نامزد کیا گیا کیونکہ وہ اس سے پہلے سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ لیکن جب میں 1890ء کی ابتداء میں لندن پہنچا اور 1893ء میں ہندوستان واپس آ گیا تو اس وقت مسٹر گاندھی، مسٹر علی امام اور مسٹر جناح میں سے ہر ایک میرے لندن کے قیام کے زمانے میں کچھ دنوں کے لیے میرا اہم عصر رہا اور اس طرح ان تینوں سے میرا رابطہ قائم ہوا۔"

مسٹر سنہا نے قائداعظم، مہاتما گاندھی، اور سر علی امام تینوں کی "خدمات" اور کارناموں کے بارے میں لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ قائداعظم کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے کہ:

"موجودہ خاکے میں، میں قوم پرست مسٹر جناح کو کچھ یادیں پیش کروں گا اور اگر وقت اور صحت نے اجازت دی تو میں ایک دوسرے مضمون میں جائزہ لوں گا کہ ایک فرقہ پرست کی حیثیت سے ان کی روش کیا تھی تاکہ ایک ساتھ دونوں جائزے مل کر جناح کی پوری زندگی کا ایک قابل اعتبار نقشہ پیش کر سکیں۔" وقت اور صحت نے شاید اجازت نہیں دی اس لیے وہ اس مقالے کا دوسرا حصہ تحریر نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر سنہا نے "وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں" میں بابائے قوم کے بارے میں لکھا ہے کہ "انہوں نے گوکھلے کو ہمیشہ حد درجہ احترام، عزت اور محبت سے نوازا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی یاد کو بھی بے حد عزیز جانا۔"

مصنف کے خیال میں:

''جناح زبردست عقلیت پسند تھے۔''

انہوں نے قائداعظم کو مغربی طرز کے لباس میں سب سے زیادہ خوش پوشاک انسان قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ Saville Row کے علاوہ کسی فرم کو اپنے کپڑوں کا آرڈر نہیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر سنہا کے مطابق قائداعظم کا انداز آخری دنوں میں بھی دلبرانہ تھا۔ اور صرف یہی نہیں قائد کے بارے میں عام تاثر کے برخلاف سنہا نے لکھا ہے کہ وہ یار باش اور خوش اخلاق انسان تھے اور ان کے لطیفے ان کی بدیہہ گوئی اور قصہ گوئی مجلس کو لالہ زار بنادیتی تھی لیکن باہر کی دنیا میں وہ محتاط رہتے اور عوامی معاملات کو نمٹانے میں درشت بھی ہوجاتے تھے۔ مصنف نے اس سوال سے بھی بحث کی ہے کہ...... ''جناح نے کس سبب سے کانگریس سے اپنا رشتہ توڑا؟''...... اس سلسلے میں کانگریس کے سالانہ سیشن منعقدہ دسمبر 1920ء کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر سنہا لکھتے ہیں کہ:

''جب جناح نے اپنی تقریر کے دوران (عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت میں) گاندھی جی کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں مسٹر گاندھی کہا تو زبردست شور مچا اور حاضرین نے جناح کو چیخ کر کہا کہ وہ گاندھی جی کو مہاتما گاندھی کہیں۔ یہ افسوسناک واقعہ سنگین صورت اختیار کرگیا کہ جناح نے حاضرین کے حکم یا ان کے دھونس جمانے کی روش کے آگے جھکنے سے انکار کردیا تھا اور صدر محترم اور عظیم المرتبت لیکن کہنہ سال SHRI VIJAY RAGHAVA CUARIAR اس کشیدہ صورت حال پر قابو پاسکے اور نہ جلسے کے بپھرے ہوئے شرکاء کو اور نہ ہی جناح کو جو گاندھی جی کو مسٹر گاندھی کہہ کر اپنے پارلیمانی حق پر مصر تھے۔ سمجھانے میں کامیاب ہوسکے۔ اس واقعہ کا ذکر کچھ تفصیل سے مسٹر اے۔ اے رؤف نے اپنی تصنیف Meet Mr. Jinnah میں کیا ہے اور اسے کانگریس کی رپورٹ میں تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ کہ جس کی اہمیت کو سمجھا گیا اور نکتہ رسی سے پسند کیا گیا گویا مصیبت کی ابتدا تھی جس نے بالآخر ہندوستان کو تقسیم کیا اور حصۂ پاکستان کو وجود میں لانے کا سبب بنا۔''

یہاں قائدِ اعظم اور دادا بھائی نوروجی کے تعلقات کا ذکر بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں بابائے قوم کے سوانح نگار اور محقق رضوان احمد کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں ان دونوں رہنماؤں کے تعلق سے انھوں نے کہا تھا کہ:

''قائدِ اعظم نے لندن میں دادا بھائی نوروجی کے الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ڈاکٹر اسٹینلی والپرٹ (امریکی مصنف) ہیکٹر بولیتھو (برطانوی مصنف) عزیز بیگ، مطلوب الحسن سید، غلام علی الانہ اور محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب ''مائی برادر'' جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ غلام علی الانہ کی مدد سے لکھی گئی ہے، ان سب کتابوں میں دادا بھائی نوروجی کے الیکشن میں قائدِ اعظم کے حصہ لینے کی بات درج ہے جو درست نہیں ہے۔ دادا بھائی نوروجی کا الیکشن 1892ء کے وسط میں ہوا تھا اور نوروجی نے اپنی کامیابی کے بعد دارالعلوم میں تقریر اگست میں کی تھی۔ اس وقت قائدِ اعظم چرچ مشن اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ مقدمہ نمبر 11 '1896 میں صاف صاف درج ہے کہ محمد علی جناح بھائی جنوری 1893ء میں لندن گئے تھے اس دستاویزی ثبوت کے بعد ان تمام سوانح نگاروں کو اپنی کتابوں میں اور مشہور عالم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کو اپنے بیان کی تصحیح کر لینی چاہیے۔''

(رضوان احمد کا انٹرویو۔ مطبوعہ روزنامہ ایکسپریس کراچی۔ سنڈے میگزین۔ ۹، ستمبر ۲۰۰۱ء)

اس کے برعکس ڈاکٹر سچد انند سنہا نے ''وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں'' میں لکھا ہے کہ:

''مستقبل کے قائدِ اعظم لندن میں 1892ء میں پہنچے اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ وہاں ہندوستانی موجود تھے وہ دادا بھائی نوروجی کے لیے ووٹ حاصل کرنے میں تندہی سے مصروف تھے دادا بھائی جو مجلس عاملہ کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ مارکوس آف سالسبری نے کچھ پہلے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تذلیل کی تھی اور وہ اس طرح کہ انھوں نے دادا بھائی نوروجی کو BLACK MAN کہا تھا اس بالقصد توہین پر ہماری برہمی عروج پر تھی اور دادا بھائی کے کارکنوں کی حیثیت سے ہمارے دماغ نہ بھی بہکے ہوں تو ہمارے قدم ضرور

بہک گئے تھے۔ جناح جو اس وقت شعلہ جوالہ تھے اور وہ ساری زندگی اسی طرح رہے اس جدوجہد میں کود گئے اس جوش اور ولولے کے ساتھ جسے ہم ان کے اٹھائے ہوئے ہر مقصد کے ساتھ منسوب کرسکتے ہیں مرکزی FINSBURY حلقے کا جہاں سے دادا بھائی مقابلہ کررہے تھے ایک خاص علاقہ ان کے سپرد کیا گیا تھا اور جو نتیجہ برآمد ہوا وہ حیرت ناک حد تک اطمینان بخش تھا اور بجا طور پر ان کی نیک نامی میں اضافہ کرتا تھا۔"

اسی تسلسل میں ذرا آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب یہ اعلان ہوا کہ دادا بھائی منتخب ہوگئے، ان کے اعزاز میں زبردست ضیافت جو مشہور HOLBORN ریستوران کے آراستہ و پیراستہ ہال میں رکھی گئی تھی جس میں پانچ سو سے زیادہ مہمان شریک تھے اپنی غیر مشتبہ کامیابی کے لیے خاص طور پر جناح کی احسان مند تھی جو کہ اس تقریب کی تنظیم کمیٹی کے سیکریٹری منتخب ہوئے تھے۔"

رضوان احمد نے اپنے انٹرویو میں قائد کے سوانح نگاروں کا ذکر کیا اور انھیں غلط قرار دیا ہے لیکن ڈاکٹر سچد انند سنہا کی حیثیت اس لحاظ سے مختلف اور ساتھ ہی اہم ہے کہ وہ قائداعظم کے ہم عصر اور ہم جلیس تھے اور دادا بھائی نوروجی کے الیکشن میں انھوں نے خود بھی حصہ لیا تھا۔ رضوان احمد نے ڈاکٹر سنہا کی کتاب غالباً نہیں دیکھی۔ انھیں اس کتاب کا جو مختصر ہونے کے باوجود کئی پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے ضرور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصورِ پاکستان

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

قائداعظم کا تصور پاکستان کیا تھا، اس کی کئی تعبیریں کی جاتی ہیں، کبھی سرکاری سطح پر، کبھی جماعتی سطح پر اور کبھی تدریسی سطح پر۔ صحیح تعبیر کی تلاش ہمیں قائداعظم کے کسی ایسے قول میں کرنی ہوگی جس میں قائداعظم نے حصولِ پاکستان کا ذکر ایک شرط کے ساتھ کیا ہو۔ ایسا ایک قول موجود ہے او رہم اسی کی روشنی میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ قائداعظم نے کہا تھا ''میں اپنا خون کس کے لیے پانی کر رہا ہوں؟ رئیسوں کے لیے؟ نہیں، بلکہ آپ کے لیے، غریبوں کے لیے۔ ایسے کئی علاقے ہیں جہاں لوگوں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا یہ پاکستان ہے؟ اگر یہ پاکستان ہے تو مجھے ایسا پاکستان نہیں چاہیے۔''

قائداعظم کے تصورِ پاکستان میں سماجی اور اقتصادی پہلو کیا تھا، اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ فی الحال ہمیں قائداعظم کے اس قول کی روشنی میں یہ طے کرنا ہے کہ آیا ان کا تصورِ پاکستان اپنے اساس میں نظریاتی ہے یا تجرباتی۔ یہاں نظریاتی سے مراد ایسا تصور ہے کہ اگر مسلمان ایک ریاست میں منظم ہے تو اس کا دین مکمل ہے اور اگر اقلیت میں ہے تو ناقص ہے بالفاظ دیگر اکراہ فی الدین کی صلاحیت ہماری قومی امنگوں کی منزل ہے۔ اگر یہ نظریاتی اساس اور یہ تصور پاکستان صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کا رویہ خواہ کتنا ہی فراخدلانہ کیوں نہ ہوتا معقول کیوں نہ ہوتا۔ مسلمان جنوبی ایشیاء کو تقسیم کرا کے دم لیتے۔

اس کے برخلاف تجرباتی اساس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ وہ اکثریتی و اقلیتی، دونوں ہی معاشروں کے لیے احکام رکھتا ہے۔ اس سے مزید یہ مراد ہے کہ یہ مسلمانوں کا تلخ سیاسی تجربہ تھا، ہندوؤں اور انگریزوں کا معاندانہ رویہ تھا جس نے مسلم لیگ کو

مطالبۂ پاکستان پر مجبور کیا۔ ایک ایسے فیصلے پر مجبور کیا جو ہمارے غیر ملکی ناقدین کے مطابق صرف سرزمینِ ہند ہی کو نہیں برصغیر کے مسلمان معاشرے کو تقسیم کر گیا۔

ایک تیسرا پہلو ذہن میں رکھیے۔ قائداعظم کا تصورِ پاکستان ایک فرد اور ایک خاص شخصیت کا تصورِ پاکستان بھی ہے۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم اس شخصیت کی سیاسی جدوجہد کے رخ کا تعین کریں اور یوں اس کے نہاں خانۂ دل سے معلوم کریں کہ اس کا تصورِ پاکستان کیا تھا۔ اس سلسلے میں قائداعظم کی وہ تقریر ناگزیر طور پر حوالہ بنتی ہے جو انھوں نے ۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی مجلس آئین ساز میں کی تھی۔ اور ادھر قائداعظم کے جو اہم ترین مطالعے شائع ہوئے ہیں ان میں بھی اس تقریر کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ عائشہ جلال کے مطابق یہ تقریر قائداعظم کے اصل مسلک اور اصل منشا کو پیش کرتی ہے جب کہ اسٹینلی والپرٹ کے نزدیک ۱۱، اگست کی تقریر ان کی فکری نہج اور دوقومی نظریہ کی صریحاً تردید کرتی ہے۔

یقیناً اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قائداعظم نے دوقومی نظریہ کی بناء پر پاکستان حاصل کیا اور نہ ہی اس امر سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس نئی مملکتِ پاکستان کو ایک قومی نظریہ کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کی سیاسی زندگی کا آغاز بقول سروجنی نائیڈو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت سے ہوا۔ مؤدبانہ طور پر عرض ہے کہ وہ آخر دم تک اسی حیثیت پر قائم رہے اور انھوں نے ازخود کبھی اس سے انحراف نہیں کیا۔ تبدیلی قائداعظم کے موقف میں نہیں آئی ملکی سیاست کے دھارے میں آئی۔ ان کے سیاسی حریفوں نے دو میں سے ایک فریق کے حقوق صلب کرنے کو حب الوطنی قرار دے دیا اس لیے قائداعظم میزان برابر کرنے کے لیے مسلم حقوق کی نگہداری پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ قائداعظم کی جدوجہد کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ بالادستی کا جواب بالادستی سے دیا جائے اور پاکستان کی اقلیت کو ہندوستانی اقلیت کی سزا دی جائے۔ پاکستان کے عوام نے بھی استقامت کے ساتھ بابائے قوم کی اسی روشن خیالی کو پروان چڑھایا اور ہر انتخاب میں ان کا رویہ علامہ اقبالؔ کے اس شعر کے مطابق رہا ہے:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بچارے دو رکعت کے یہ امام

غرض میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء اور ۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کے درمیانی ۳۰ سال قائداعظم کن تجربات سے

گزرے اور کس کس طرح انھوں نے اپنی انا کو قومی مقصد کی خاطر قربان کیا اس روداد کا بہت مختصر خاکہ محض چند لفظوں میں۔

قائداعظم ۱۹۲۰ء میں ناگپور اجلاس میں کانگریس سے علیحدہ ہوئے جب انھیں ناملائم اور ناروا رویہ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے باوجود جب سائمن گو بیک کا مرحلہ آیا تو قائداعظم نے مسلم لیگ کی تقسیم گوارا کرلی لیکن قومی مفاد کی خاطر کانگریس کو تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ واضح رہے کہ سائمن کمیشن کی مخالفت ڈرائنگ روم کی سیاست نہ تھی عوامی احتجاج کی سیاست تھی۔ اس تعاون کا پھل انھیں نہرو رپورٹ کی صورت میں ملا جس میں کانگریس کی منظور شدہ بلکہ توثیق شدہ دہلی مسلم تجاویز کو مسترد کردیا گیا تھا۔ مگر اس بحران کو بھی قائداعظم نے انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں انھوں نے ''نواب چھتاری کی سرکاری جماعت کے خلاف کانگریس اور مسلم لیگ کے غیر رسمی تعاون کی حوصلہ افزائی کی۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب سال کے آغاز پر پنڈت نہرو نے قائداعظم کو یہ کہہ کر مشتعل کیا تھا کہ ملک میں دو ہی قوتیں ہیں انگریز اور کانگریس۔ قائد اعظم نے فوراً جواب دیا مسلمان تیسری قوت ہیں اور مسلم لیگ کسی کی بھی بے دام غلام نہیں۔ اس ردوبدل کے باوجود انھوں نے تیسرے غیر ملکی فریق کے خلاف تعاون کو جاری رکھا۔ یہ مفاہمت عام انتخابات تک ہی نہیں ضمنی انتخابات تک جاری رہی۔ کانگریسی رہنما رفیع احمد قدوائی محض مسلم لیگ کے تعاون سے منتخب ہوسکے تھے مگر اس بار بھی کانگریس نے نیکی کا بدلہ بدی سے دیا۔ شروع میں جب کانگریس نے وزارت تشکیل دینے سے انکار کیا تو مسلم لیگ نے انگریزوں کی ہر پیشکش ٹھکرادی اور کانگریس کا ساتھ دیا۔ خفیہ رپورٹ سے جواب سامنے آئی ہے پتہ چلتا ہے کہ لیاقت علی خان نے صرف وزارت کی پیشکش کو ہی مسترد نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے نواب چھتاری کو بھی غیر جمہوری اقلیتی حکومت وضع کرنے سے منع کیا تھا۔

مگر کیا ہوا؟ جب کانگریس وزارت بنانے پر راضی ہوئی تو نہرو نے مسلم لیگ جیسی ''چھوٹی جماعت'' کو شامل کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ساتھ وہ مغائرت کا سلوک ہوا جس کی گواہی فضل الحق کمیٹی، شریف کمیٹی اور راجہ پیر پور کمیٹی کے علاوہ مہا سبھائی رہنما این بی کھارے نے بھی دی ہے۔ اب بات سیاسی انعامات کی تقسیم سے بہت آگے نکل چکی تھی، اس لیے قائداعظم کو بھی ایک بہت بڑا قدم اٹھانا پڑا۔

اس مرحلے تک قائداعظم مسلمانوں کو اقلیت تسلیم کر کے ان کے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے مگر اب انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ محمد علی جناح آئینی قانون کے ماہر تھے وہ جانتے تھے کہ اقلیتوں پر ملکی قانون کا نفاذ ہوتا ہے جبکہ قوموں پر بین الاقوامی قانون جس کے مطابق آبادی اور رقبے میں فرق کے باوجود ہر قوم حق آزادی میں مساوی ہوتی ہے۔ غرض ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے بعد سے قائداعظم دو قومی نظریے کے مطابق مسلمانوں کے لیے تصفیہ تلاش کرتے رہے۔ اس کے مضمرات کیا تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل تقسیم ہند پر تو راضی ہو گئے مساوات یا Parity پر کبھی راضی نہ ہوئے۔

اس پس منظر میں ہم اپنے پہلے سوال پر واپس آتے ہیں کہ آیا قائداعظم کے تصور پاکستان کی اساس نظریاتی تھی یا تجرباتی۔ دو قومی نظریہ تو بہر حال نظریہ ہے لیکن وہ مذہبی آزادی اور مذہبی استبداد میں فرق کرتے تھے۔ یہاں ایک بیچ ترجمہ نے بھی ڈالا ہے۔ ہم Theory کو بھی نظریہ کہتے ہیں اور Ideology کو بھی۔ اس سے خلط مبحث بہت پھیلا ہے۔ اس کی دو مثالوں سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔ ایک جانب نواب زادہ شیر علی خاں نے بیان دیا تھا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج منسوخ کیے جائیں کہ یہ پاکستان کی Ideology کے خلاف ہیں دوسری جانب محترمہ بے نظیر بھٹو Two Nation Theory کو ایک بوجھ سمجھنے لگی ہیں۔ News Line جون 1991ء ص ۳۶ پر ان کی یہ عبارت موجود ہے:

> "India in turn accuses (again not without reason) of continued adherence to the two-nation theory with Islam as our vaison d'etre."

میں ان سفارشات کی تائید نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہ مظاہرہ مقصود ہے کہ یہ اصطلاحیں بھی کثرتِ تعبیر کا شکار ہیں۔ اس لیے میں جو نظریہ اور تجربہ میں امتیاز برت رہا ہوں اس پر ہمدردانہ غور کریں۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ قائداعظم دو قومی نظریہ کو Theory کی سطح پر رکھتے تھے Ideology کی سطح پر نہیں۔ وہ مذہبی آزادی کے قائل تھے، مذہبی استبداد کے نہیں۔ اس کے دو شواہد ہیں۔

۱۔ پہلی بات وزارتی مشن منصوبے سے متعلق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کہیں گے کہ Cabinet Mission Plan کو بدرجہ مجبوری قبول کیا گیا تھا اس لیے اسے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن ایسی بات نہیں Cabinet Mission Plan ۱۶، مئی ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا جبکہ میں چار دن پہلے ۱۲، مئی ۱۹۴۶ء کی بات کر رہا ہوں یعنی جس دن مسلم لیگ نے کابینہ مشن کو اپنی تجاویز پیش کی تھیں۔ مسلم لیگ کی پیش کردہ تجاویز میں ہندوستان اور پاکستانی علاقوں کے درمیان مشترکہ مرکز کو شامل کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کی تجویز اور کابینہ مشن منصوبے کے درمیان فرق یہ تھا کہ قائداعظم دو گروہوں میں تقسیم چاہتے تھے جبکہ کابینہ نے تین گروہوں کی سفارش کی دیگر قائداعظم مرکز میں مقننہ نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اسے ٹیکس عائد کرنے کا اختیار دینا چاہتے تھے۔

۲۔ دوسری گواہی راجہ صاحب محمود آباد کی ہے جو بقول خود مسلم لیگ کے اندر ایک اسلامی جماعت قائم کیے بیٹھے تھے اور اس نہج کی اسلامی ریاست کی نوید دینے لگے جس کا مظاہرہ بعد میں شیر علی خان نے کیا۔ راجہ صاحب اپنی خودنوشت میں تحریر کرتے ہیں کہ اس نقطے پر قائداعظم اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور راجہ صاحب ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ بعد میں انھیں احساس ہوا کہ قائداعظم کا موقف درست تھا اور ان کا موقف غلط تھا۔ یہ معمولی شہادت نہیں راجہ صاحب محمود آباد ہمارے ملک کے محسنوں میں ہیں دامے درمے سخنے قدمے ہر طرح سے پاکستان کے لیے قربانی دی۔ راجہ صاحب پاکستان میں مذہبی تشدد کے اولین مظاہرے دیکھ چکے تھے اس لیے انھوں نے قوم کی اصلاح کی خاطر بہت فراخدلی سے اپنے بدلے ہوئے موقف کو ظاہر کر دیا۔

قائداعظم کا موقف تبدیل نہیں ہوا۔ ان کا شروع سے موقف یہ تھا کہ مذہبی منافرت نہ پھیلائی جائے۔ ان کا شروع سے موقف تھا کہ اکثریت اقلیت کو محکوم نہ بنائے۔ یہی ان کے جدوجہد کی روح تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ پاکستان میں اقلیتوں کو مساوی حقوق نہ دیتے۔ یہ قائداعظم کی حقیقت پسندی تھی جس کی بناء پر انھوں نے کسی رعایت کے بغیر تقسیم ہند کا مطالبہ کیا۔ یہ ان کی حقیقت پسندی تھی جو انھوں نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ اپنی قوم کی تقدیر کو سنوارنے کے لیے

اسے محکومی سے بچانے کے لیے انھوں نے پاکستان کو قائم کیا۔ انھوں نے کانگریس اور انگریزوں کی بار بار کی بدعہدی کی بنا پر تقسیم ہند کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ اور مجھے کہنے دیجیے کہ بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے یہاں اس اعادہ کا کیا محل ہے ابھی بتاتا ہوں۔

گزشتہ دنوں ۳۰، مئی ۱۹۹۷ء کے ''ڈان'' میں جناب مہر علوی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں یہ عبرت انگیز عبارت موجود ہے۔ پاکستانی عوام کے ایک گروہ میں یہ واضح رجحان موجود ہے کہ قائداعظم حتیٰ کہ ان کی تخلیق کی تخفیف کی جائے:

"There is a positive trend amongst a section of the people of Pakistan to tilt the Quaid and his very creation."

بہتر ہوگا اگر ہم اس رجحان کی موجودگی سے انکار نہ کریں۔ یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ اگر مسلمان دو ملکوں میں تقسیم نہ ہوتے تو ناقابلِ تسخیر قوت بن کر ابھرتے۔ یہ خوش فہمی اور خام خیالی دانستہ پھیلائی جا رہی ہے۔ برطانوی دور میں تو مسلمان ایک تھا پھر فسادات میں کیوں نقصان اٹھاتا تھا؟ دیکھیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا مسلم اکثریتی علاقے یا مسلم اقلیتی علاقے۔ مسلم اکثریتی علاقہ کشمیر ہے جہاں مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے مسلم اقلیتی علاقہ ممبئی ہے جہاں بابری مسجد کے انہدام کے بعد خوں ریز فسادات ہوئے۔ گویا اگر ریاستی ادارے نہ ہوں تو ہم بھی تشدد کا نشانہ بن جائیں۔

رہی یہ بات کہ تصورِ پاکستان کی اساس نظریہ نہیں تجربہ ہے تو اس ضمن میں یہ بات یاد رکھیے کہ تجربہ نظریہ سے افضل ہے۔ نظریہ تجربہ کی تصدیق نہیں کرتا۔ تجربہ نظریہ کی تصدیق کرتا ہے اور اگر آپ کو نظریاتی توجیہہ پر اب بھی اصرار ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ پاکستان صرف جغرافیائی اعتبار سے نہیں نظریاتی اعتبار سے بھی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان واقع ہے ہندوستان سے مذہبی تشدد کی شکایتیں آ رہی ہیں۔ افغانستان سے مذہبی جبر کی شکایتیں آ رہی ہیں کم سے کم ہم قائد اعظم کے تصورِ پاکستان کے مطابق اپنی روشن خیالی پر قائم ہیں۔ شکریہ!

◆◆◆

# محمد علی جناح کا تصورِ وفاق

مترجم: ڈاکٹر سید جعفر احمد

معمارانِ وطن نے پاکستان کا تصور ایک وفاقی طرز حکومت کے طور پر کیا تھا، یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت کی آزادی سے پہلے کی تمام آئینی دستاویزات، محمد علی جناح کے بیانات اور دیگر متعلقہ ذرائع پوری طرح اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جبکہ وفاقی طرز کی تفصیلات پر کبھی بھی مسلم لیگ کی قیادت نے غور وفکر نہیں کیا۔

لہٰذا آئین بنانے والوں کو قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی کام بھی کرنا پڑا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے پاس اس موضوع پر قائداعظم کے تصورات سے متعلق مواد موجود نہیں تھا۔

وفاقی طرزِ حکومت کی اچھائیوں اور برائیوں سے متعلق قائداعظم کی رائے برصغیر میں آزادی کی جدوجہد کے پس منظر پر بنی تھی۔ جدوجہد آزادی کو مختلف پہلوؤں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے نکتۂ نظر سے اس جدوجہد کے دو پہلو بہت اہم ہیں۔ پہلا حصہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۳۵ء کے بھارتی قانون کے تحت ۱۹۳۷ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ جن کے بعد مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب اور صوبائی خودمختاری پر زور دیا۔

بھارت میں ۱۸۸۳ء سے مسلم قائدین کا ایک گروپ یہ بات کہتا رہا ہے کہ بھارتی عوام مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لہٰذا انھیں مرکز میں مناسب نمائندگی ملنی چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق جب ۱۸۹۲ء کے قانون کے تحت قائم کونسلوں میں توسیع کی جارہی تھی تب ان مسلم قائدین نے مسلمانوں کو ایک الگ فرقے کے طور پر حقوق دینے کے لیے زور دیا۔

حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم کیا تھا کیونکہ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے مطابق کونسلوں کے انتخابات میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی نہیں ہو پائی تھی۔ بعد میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ حکومت ہندوستانیوں کو ملک کے انتظامی معاملات میں شریک کرنا چاہتی ہے یا ان کو قوانین بنانے کا اختیار دینا چاہتی ہے تب مسلم قیادت نے ملکی حکومت اور مجلس قانون ساز دونوں میں جائز حصہ دینے کا مطالبہ کیا۔

جہاں تک صوبائی خودمختاری کا تعلق ہے تو ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات سے پہلے ہی متفقہ طور پر یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ہندوستان میں وفاقی طرزِ حکومت ہونا چاہیے اور یہ بات مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی بہت مناسب تھی۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں مزید مسلم صوبوں کا تقاضہ اس وجہ سے بھی تھا کہ مسلمان حکومت میں بڑے حصے کے طلبگار تھے اور ان صوبوں کی قانون سازی بھی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے ساتھ صلح پسندی کا رویہ اختیار کرنے اور ہندو اکثریتی صوبوں و مرکز میں مناسب قانون سازی پر مجبور ہوں گے۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے مطابق دی گئی صوبائی خودمختاری بہت محدود تھی۔ جبکہ لیگ مزید خودمختاری کے حصول کی خاطر جدوجہد کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں ۲۳/۲۴ مئی ۱۹۲۴ء کو لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۵ویں اجلاس میں شیخ عبدالقادر نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید شیخ نیاز محمد نے کی اور جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ:

> ''ہندوستان میں موجود صوبے ایک وفاقی حکومت کے تحت متحد ہوں گے تاکہ انھیں مکمل صوبائی خودمختاری حاصل ہو سکے۔ مرکزی حکومت کی کارکردگی کو مشترکہ عام معاملات تک محدود کیا جا رہا ہے۔''

نہرو رپورٹ میں دی گئی تجاویز پر نظرثانی کے لیے دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں منعقدہ آل پارٹیز کنونشن میں قائدِاعظم نے دوسری باتوں کے علاوہ صوبوں کے لیے اضافی خودمختاری کی تجویز دی تھی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ صوبوں کو بقیہ اختیارات بھی تفویض کیے جائیں۔ انھوں نے فرمایا:

> ''ہم نے معاملات پر محتاط طریقے سے غور کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ صوبوں کو خودمختاری سے متعلق تمام اختیارات دینے کا طریقہ ہی وفاقِ ہند کے لیے بہت مناسب ہوگا۔''

۱۹۲۹ء میں قائداعظم کے پیش کردہ مشہور چودہ نکات میں سب سے پہلا نکتہ وفاق سے متعلق ہی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے:

''مستقبل کا آئین وفاقی طرز کا ہونا چاہیے، جس میں صوبوں کو بقیہ تمام اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ مرکزی حکومت کو صرف ان مشترکہ معاملات کی نگرانی کرنی چاہیے جن کی آئین نے ذمہ داری دی ہو۔''

دوسرے نکتے میں یہ کہا گیا ہے:

''تمام صوبوں کو خودمختاری کے یکساں اختیارات ملنے چاہئیں۔ اور چودھویں نکتے میں یہ درج ہے کہ ''آئین میں کوئی بھی ترمیم وفاق ہند پر مشتمل صوبوں کے اتفاق رائے سے ہی لائی جاسکتی ہے۔''

۱۹۳۰ء کی ابتداء ہی سے قائداعظم برطانوی حکومت پر زور دیتے رہے ہیں کہ ہندوستانی صوبوں کو خودمختار ہونا چاہیے۔ لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں انھوں نے صوبوں کو مکمل اختیارات کے ساتھ وفاقی طرزِ حکومت کی زبردست طریقے سے تائید کی تھی۔ پہلی دسمبر ۱۹۳۰ء سے تیرہ جنوری ۱۹۳۱ء تک منعقد ہونے والے وفاقی طرزِ حکومت سے متعلق سب کمیٹی کے اجلاس میں اپنی تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے برطانوی حکومت کو ہندوستان میں وفاقی طرزِ حکومت صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ اپنے اصل مفہوم میں متعارف کرانے پر زور دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ صرف دفاع، خارجہ امور اور فوج مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ مرکز دو ایوانوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جس میں ایوانِ بالا کو صوبائی حکومتیں منتخب کریں اور ایوانِ زیریں کو عوام منتخب کریں۔ قائداعظم کا تجویز کردہ نظامِ حکومت وفاقی قوانین پر مبنی تھا۔ برخلاف اس کے حکومت ہند کے ایکٹ ۱۹۳۵ء کو مکمل طور پر وفاقی قانون نہیں کہہ سکتے۔

۱۹۳۷ء کی ابتدا میں ہونے والے انتخابات کے نتائج ہندوستان کے سیاسی ارتقا کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ مسلم لیگ اہمیت کی حامل سیٹیں لینے میں ناکام ہوچکی تھی اور مسلمانوں کے لیے محفوظ ۴۸۲ سیٹوں میں سے صرف ۱۰۹ سیٹیں حاصل کرسکی۔ مسلم لیگ کی کارکردگی کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ تھی کہ یہ چار میں سے تین مسلم اکثریتی صوبوں میں مکمل طور پر ناکامیاب

ہو چکی تھی، یعنی نارتھ ویسٹ فرنیئر (سرحد)، پنجاب اور سندھ میں۔ انتخابات کے نتائج لیگ کے اس دعویٰ کو درست ثابت نہیں کر رہے تھے کہ وہ مسلم ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس گیارہ میں سے چھ صوبوں میں کامیابی حاصل کر چکی تھی اور دیگر دو صوبوں میں معتدبہ سیٹوں کی حقدار بنی تھی۔ جبکہ صوبہ سرحد کے علاوہ دیگر مسلم اکثریتی صوبوں میں کانگریس بھی اکثریت حاصل نہیں کر سکی تھی۔ جواہر لال نہرو نے کانگریس کی اس ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ناکامی اس لیے ہوئی کہ کانگریس مسلم عوام تک پہنچ نہیں سکی۔

یو پی اور بمبئی میں مسلم لیگ نے ۶۴ میں سے ۲۷ اور ۲۹ میں سے ۲۰ سیٹیں حاصل کر لی تھیں۔ انتخابات کے بعد چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خان نے یو پی میں کانگریس کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی کوشش کی۔ خلیق الزماں جو اس وقت مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے چیئرمین تھے، یہ چاہتے تھے کہ صوبائی حکومت میں لیگ کو دو سیٹیں مل جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس سے متفق تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کو اسمبلی میں لیگ کا تعاون حاصل رہے گا۔ مگر نہرو اس سلسلے میں الگ رائے رکھتے تھے۔ انھوں نے لیگ کو ایک سے زیادہ سیٹیں دینے کے لیے منع کر دیا۔ مولانا آزاد و دیگر تاریخ داں مثلاً ایچ وی ہڈسن اور پینڈرال مون یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نہرو کا خلیق الزماں کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں بہت سخت رویہ تھا، جس نے ۱۹۴۰ء میں پاکستان کے مطالبے کی راہ کھول دی۔ اُما کور نے اپنی کتاب ''مسلمز اینڈ انڈین نیشنلزم ۱۹۲۸-۴۰ء'' میں اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور لکھا کہ یہ ایک سہل پسند سوچ ہے کیونکہ مذاکرات مسلم لیگیوں کی تعداد کی بنیاد پر منقطع نہیں ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہرو خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں دونوں ہی کو شامل کرنا چاہتے تھے بشرطِ کہ وہ اُن شرائط کو مان لیں جو ان کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ پہلی شرط جو نہرو نے تحریر کی وہ یہ تھی کہ پہلی مارچ ۱۹۳۷ء کو وردھا میں، کانگریس کی اسمبلی پالیسی سے متعلق ورکنگ کمیٹی کی قرارداد سے لیگ کا مکمل اتفاق۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اسمبلی کا کوئی بھی ممبر، جو کہ کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب نہ ہوا ہو، لیکن کانگریس کے قوانین سے اتفاق کرتے ہوئے حلف اُٹھانا چاہے اسے کانگریس پارٹی اسمبلی میں اپنے ساتھ شامل کر سکتی ہے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ اسمبلی میں شامل لیگی گروپ بشمول یو پی کے لیے پارلیمانی بورڈ کانگریس پارٹی کے ممبر بن سکتے ہیں۔ تیسری شرط یہ تھی کہ ضمنی انتخاب میں لیگ اپنا الگ امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ اُما کور کے

مطابق خلیق الزماں نے پہلی شرط مان لی تھی مگر دوسری اور تیسری پر وہ تیار نہیں تھے۔

جو بھی بات ہو لیکن یو پی میں مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ نہرو کے رویے نے قائداعظم کو یہ باور کرا دیا تھا کہ کانگریس مسلم لیگ کے وجود کو برداشت نہیں کرے گی۔ اس لیے قائداعظم نے خلیق الزماں کو کہا کہ وہ کانگریس کے ساتھ کسی معاہدے سے گریز کریں۔

ان حالات کی وجہ سے ہی قائداعظم نے اپنی پیش کردہ انڈین فیڈریشن کی تجویز کو تبدیل کر دیا اور ان امیدوں کو چھوڑ دیا کہ برصغیر کی مسلم برادری کے متحدہ ہندوستان میں تمام جمہوری حقوق محفوظ رہیں گے۔ ۱۹۳۷ء کے وسط سے قائدِ اعظم جن دو باتوں کی طرف متوجہ ہوئے وہ یہ ہیں:

(۱) ہندوستان کی عمومی مسلم آبادی کی حمایت حاصل کرنا اور مسلم لیگ کو مسلم عوام کی پارٹی بنانا۔

(۲) وفاقیت کو ہندوستانی فرقہ پرستی کا حل نہ سمجھنا۔

قائداعظم کی کوششوں سے لیگ کو ہندوستان کی مسلم عوامی پارٹی بنانے کے عمل کو اُس وقت تقویت ملی جب بنگال اور پنجاب کی مسلم قیادت خصوصاً مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات دونوں صوبائی وزرائے اعلیٰ نے ملکی معاملات میں جناح صاحب کی قیادت کو تسلیم کیا۔

۱۹۳۸ء میں پیرپور رپورٹ کی اشاعت نے یہ واضح کر دیا تھا کہ کانگریسی حکومت بہت سے معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ غیر منصف رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ یہ فیصلہ ہندوستانی اسمبلی سے مشورے کے بغیر کیا گیا اور ساتھ ہی ہندوستانی صوبوں کو وفاقیت کے تحت مجتمع کرنے کا کام بھی رک گیا۔ ان معاملات نے کانگریس کو بددل کر دیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے وزراء احتجاجاً مستعفی ہو جائیں۔ اس فیصلے پر مسلم لیگ نے 'یوم فیصلہ' منایا۔

اس پس منظر میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مشہور قراردادِ لاہور، جسے بعد میں قراردادِ پاکستان کہا گیا، منظور کی گئی۔

اس قرارداد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تقسیم ہند اور علاحدہ مسلم ریاستوں کا قیام ہے۔ بعد میں قائداعظم نے فرمایا کہ مشرقی اور شمالی ہندوستان کے مسلم اکثریتی ارازیاں اسی ریاست کا حصہ ہوں گی۔ دہلی میں منعقدہ ۱۹۴۶ء کے اراکینِ لیگی مجلس قانون ساز کے کنونشن نے بھی اپنی قرارداد کے ذریعہ قائداعظم کے بیان کی تائید کر دی۔

قراردادِلاہور کا یہ حصہ متحدہ ہند میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے ایک طرف تقسیم ہند کی ناگزیریت پر زور دے رہا تھااور دوسری طرف اس سلسلے میں وفاقی طریقۂ کار کی مخالفت کر رہا تھا۔ بعد میں متعدد مواقع پر قائداعظم نے متحدہ ہند میں وفاقی طریقہ کار پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔۱۹۴۳ء میں انھوں نے وفاق اور متحدہ ہند کی تجاویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

''کچھ آئینی پنڈتوں نے ہم سے سوال کیا کہ ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق یا اتحاد کیوں نہیں ہوسکتا؟ کچھ افراد اس قسم کی بات کرتے ہیں......اور کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ متحدہ اکایوں کو وسیع اختیارات دینا چاہیے اور بقیہ اختیارات اکایوں کے پاس رہنے چاہیے۔مگر یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں کی پوری آئینی تاریخ کو بھول جاتے ہیں۔وفاق کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اور جس اصطلاح میں یہ بات کہی گئی ہے اس میں وفاقی اکائیوں کو تمام حیاتی معاملات سے محروم کیا گیا ہے۔اکائیاں اپنے بجائے مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے پر مجبور کی جائیں گی۔حتیٰ کہ آخر میں وہ خود طاقتور مرکزی حکومت بنانے پر تیار ہوجائیں۔اگر وفاقی حکومت کو بنیاد بنایا گیا تو یہ کلیتاً لازمی ہوجائے گا۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ء تک قائداعظم متحدہ ہند میں وفاقی طریقۂ کار کو نامناسب سمجھنے لگے تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ سوچ مضبوط ہوتی چلی گئی،صرف ایک موقع کے علاوہ جب وہ متحدہ ہند کے پلان پر بات کرنے کے لیے تیار تھے۔یہ وہ موقع تھا جب انھوں نے ابتدائی طور پر کیبنٹ مشن پلان کو مان لیا تھا جس کے تحت ہندوستان میں تین طرح کے صوبوں کا اتحاد ہونا تھا۔اس پلان میں کہا گیا تھا کہ دفاع، خارجہ معالات اور اطلاعات مرکزی حکومت کے تحت ہوں گے جبکہ صوبوں کو دیگر تمام معاملات کی ذمہ داری دی جائے گی۔

حالانکہ قائداعظم نے متحدہ ہند میں وفاقی طرزِ حکومت کی مخالفت کی تھی مگر آزاد مسلم مملکت میں وہ صرف وفاقی طرزِ حکومت ہی بنانا چاہتے تھے۔یہ قراردادِلاہور سے ظاہر ہوتا ہے جس کے دوسرے حصے میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے:

''یہ قرارداد منظور کی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کوئی بھی آئینی تجویز اس ملک میں کارآمد نہیں ہوگی یا مسلمانوں

کو قبول نہیں ہوگی جب تک کہ وہ مندرجۂ ذیل اصولوں پر تیار نہ کی گئی ہو:

کہ جغرافیائی متصل اکائیوں کی جو حدبندیاں اس خطے میں موجود ہیں ان کو ضرورت کے تحت آئینی اور قانونی طور پر اس طرح دوبارہ ترتیب دیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، جیسا کہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقہ میں ہے، انھیں اس طرح مجتمع کیا جائے کہ وہ آزاد ریاستیں بن جائیں، جن میں آئینی اکائیاں خودمختار اور مقتدر ہوں۔"

قرارداد میں مزید کہا گیا کہ:

"یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ان اصولوں کے مطابق ایک آئین تیار کرے۔ جس میں نتیجتاً یہ مفروضہ بھی شامل ہو کہ انفرادی طور پر ہر علاقے کو تمام اختیارات جیسے کہ دفاع، خارجہ امور، مواصلات واطلاعات، کسٹم اور اسی قسم کے دیگر ضروری معاملات بھی تفویض کر دیے جائیں گے۔"

خودمختار اور مقتدر (فرماں رواں) کے الفاظ قرارداد میں وفاقی آئین کے پس منظر میں استعمال کیے گئے تھے۔ حقائق نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ قرارداد میں اُن موضوعات کی صراحت کی گئی ہے جو مرکزی حکومت کے لیے تصور کیے گئے تھے۔

۱۹۴۴ء میں گاندھی اور جناح کی خط و کتابت قائداعظم کی وفاقی طرزِ حکومت کے ساتھ پابندی کی غماص ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۴ء کے خط میں گاندھی نے اُن اکائیوں کی تعداد کے متعلق دریافت کیا ہے جو آزاد ریاستوں پر مشتمل تھے۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے واضح کیا کہ آئینی اکائیاں ہی حقیقت میں پاکستان کی وفاقی اکائیوں کو ترتیب دیں گی۔

قراردادِ لاہور کی منظوری کے پانچ سال بعد قائداعظم نے پاکستان میں ہونے والے طرزِ حکومت کے متعلق مزید واضح کیا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا:

"نظریہ پاکستان اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ قومی حکومت کی وفاقی اکائیوں کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو کہ آپ کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے آئین میں ملتے ہیں۔ لیکن چند نہایت اہم اختیارات

مرکزی حکومت کے پاس ہی رہیں گے مثلاً مالی معاملات، قومی دفاع اور دیگر وفاقی ذمہ داریاں۔"

اسی طرح ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کے ایک بیان میں، یعنی پاکستان کے وجود میں آنے سے اٹھارہ ماہ پیشتر قائداعظم نے اپنے یقین کلی کو دہراتے ہوئے کہا کہ "وفاقیت ہی وہ اصول ہے جس پر مستقبل کی مسلم ریاست کی تنظیم کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہماری پاکستانی حکومت شاید وفاقی حکومت ہوگی جو خود مختار صوبوں پر مشتمل ہوگی جبکہ دفاع وخارجہ امور مرکز کے پاس ہوں گے۔"

انہوں نے شاید کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ انھیں پاکستان کے وفاق ہونے پر کوئی شک تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ آئین پسند تھے، اور کسی ایسے معاملے پر اپنا فیصلہ نہیں سنانا چاہتے تھے جو اصولی طور پر ایک جمہوری تنظیم جیسے کہ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو طے کرنا چاہیے نہ کہ کسی ایک فرد کو، چاہے وہ کتنا ہی اہم اور بااثر ہو۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بیان کو یہ کہتے ہوئے ختم کیا کہ "یہ مجلس قانون ساز کو طے کرنا ہوگا۔"

قائداعظم کے یہ بیانات فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے لیے تھے مگر اس کی تشکیل اس طرح ہونی تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو اختیارات دینے تھے کہ آیا وہ ملک کی تقسیم سے متفق ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو ہی آخر میں وفاقِ پاکستان کی تشکیل دینی تھی۔ پاکستان کی وفاقی بنیادیں اس حقیقت سے مزین ہوتی ہیں کہ ہندوستانی ریاستوں، جنھوں نے بعد میں پاکستان سے الحاق کیا، نے وفاق پاکستان میں شامل ہونے کے لیے بنائی گئی کسی اسکیم کے تحت ایسا نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کا تقسیم کا کاخاکہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا تعلق برطانوی ہندوستانی صوبوں اور برطانوی حکومت کی اس حکمت عملی کے مطابق تھا جو ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن میمورنڈم میں غیر تبدیل شدہ حالت میں موجود ہے۔ یہ حکمت عملی اس بات سے مشروط ہے کہ برطانوی ہندوستان میں خود مختار یا آزاد حکومت یا حکومتوں کے قیام کے بعد تاج برطانیہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ ہندوستانی ریاستوں پر اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو قائم رکھ سکے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تاج برطانیہ سے ریاستوں کے تعلقات اب مزید باقی نہیں رہیں گے اور ریاستوں کے جو اختیارات اقتدارِ اعلیٰ نے سلب کیے تھے وہ انھیں واپس مل جائیں گے۔ سیاسی انتظامات جو ریاستوں اور تاج برطانیہ کے درمیان قائم تھے وہ ختم ہو جائیں گے۔ ان ریاستوں

کے مستقبل کے بارے میں دستاویز میں تحریر ہے کہ، خلاء یا تو وہ ریاستیں پُر کریں گی جو وارث حکومت یا برطانوی ہندوستان کی حکومتوں یا اس سے کوتاہی کے بعد سیاسی تصفیہ کے تحت اس میں شامل ہوں گے۔

آزادی کے وقت پاکستان میں چار صوبے تھے مشرقی بنگال، پنجاب، سندھ اور این ڈبلیو ایف پی۔ ملک کا ایک حصہ سابقہ ہندوستانی یا شاہانہ ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ان ریاستوں میں قلات، لسبیلہ، مکران، خاران، دیر، امب، سوات، چترال، خیر پور اور بہاولپور نے وفاق پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس سے الحاق کر لیا۔

چونکہ ان ریاستوں کو صوبوں کا درجہ نہیں دیا گیا (سوائے ان ریاستوں کے جنھوں نے پچھلے برطانوی بلوچستان کے ساتھ مل کر ۱۹۷۰ء میں صوبہ بلوچستان کی تشکیل کی) اور انھیں پنجاب، این ڈبلیو ایف پی اور سندھ صوبوں کے ساتھ ملا دیا گیا، انھیں وفاقی اکائیاں نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن چونکہ انھیں تقسیم سے پہلے بھی کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی، لہٰذا وفاق پاکستان کے ساتھ ان کا الحاق پاکستان کی وفاقی حیثیت کے لیے وزن رکھتا ہے۔ جنھوں نے رضا کارانہ طور پر الحاق کیا تھا۔ ان ریاستوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق میں حقیقتاً معاشی فوائد مدِ نظر رکھے ہوں گے۔ مزید یہ کہ پاکستانی ریاستوں سے ان کے تاریخی تعلقات نے انھیں یہ فیصلہ کرنے کی ترغیب دی۔ اسی لیے آر۔ ایل۔ واٹس نے اپنی مشہور کتاب ''نئے وفاق: دولتِ مشترکہ میں تجربات'' میں تحریر کیا:

> ''مختلف معاشیات اور مواصلات کے مابین قائم برطانوی قانون کے ارتقا نے اتحاد کی خواہش کو فروغ دیا ہے۔ پہلے سے موجود تجارتی، صنعتی اور مالی تعلقات نے ہندوستان اور مغربی پاکستان کو متحد کیا اور شاہانہ ریاستوں کو دو آزاد وفاقوں تک فوراً پہنچا دیا۔''

قائداعظم یہ بات پوری طرح جانتے تھے کہ صوبے اور ریاستیں جو پاکستان کا حصہ بنیں گی کی خود مختاری اور اقتدار کی ایک طویل تاریخ رکھتی ہیں۔ وہ ایک مدبر تھے جو تاریخ کا عمیق ادراک رکھتے تھے۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ یہ اکائیاں پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اپنی خود مختارانہ حیثیت کو خوشی سے ترک کر دیں گے۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے ہندوستان کے اکثریتی صوبوں کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گے تو ان کی علاقائی خود مختاری پر اثر

نہیں پڑے گا۔ اگر انھوں نے یہ ضمانت نہ دی ہوتی، تو ان کے لیے مطالبہٗ پاکستان میں ان کی حمایت کرنا مشکل ہوتا، خاص طور پر ان علاقوں سے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اس وجہ سے انھیں ہندوؤں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

نتیجتاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وفاق پاکستان اس وقت سے وجود میں آسکا جب کہ مسلم لیگ اور قائداعظم نے برصغیر کے وسیع وفاق کی تجویز کو رَد کردیا، جس کے متعلق قائداعظم کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ دو اقوام کے اختلافات میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکتی اور جلد ہی یہ جاگیرداروں کا اکھاڑہ بن جائے گا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا، قائداعظم کو یقین تھا کہ اگر ملک میں فرقہ پرستانہ مسائل پیدا نہیں ہوئے تو ایک وفاقی منصوبہ، جو زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا حامل ہو، علاقائی اختلافات کو ختم کر کے ہم آہنگی پیدا کرسکتا ہے اور عوامی اتحاد قائم کرسکتا ہے۔

◆◆◆

# قائد کا اشتراکی تصور اور رہبری

## ڈاکٹر جمال نقوی

اکتوبر ۱۹۱۳ء میں جب وزیر حسن اور مولانا محمد علی نے لندن میں محمد علی جناح سے ملاقات کی اور انھیں قائل کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور لیگ کانگریس اتحاد کے لیے کام کریں تو جناح صاحب نے اس شرط کے ساتھ مسلم لیگ میں شمولیت کا عندیہ دیا کہ کانگریس سے ان کے تمام تعلقات قائم رہیں گے۔

یہ جناح صاحب کی اشتراکی سوچ ہی کا کرشمہ تھا کہ ان کی انتھک کوششوں سے لکھنؤ معاہدہ طے پایا اور اس کی منظوری دونوں جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں متفقہ طور پر دی گئی۔ لکھنؤ معاہدے کے تحت مسلمانوں کے بہت سے مطالبات کو تسلیم کیا گیا۔ خصوصی طور پر مسلمانوں کا علیحدہ ووٹ کا بنیادی مطالبہ۔ اسی لیے لکھنؤ معاہدے کو مسلمانوں کی کامیابی قرار دیا گیا جس میں محمد علی جناح کا اہم کردار تھا۔ جبکہ گوکھلے کی بھرپور حمایت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ووٹ کے حق کو مان کر کانگریس قیادت کی نئی نسل کو تکلیف میں ڈال دیا تھا۔ مسلمان اس لیے خوش تھے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ مشترکہ انتخابات میں وہ جائیداد کی شرط کی بناء پر کہیں سے بھی منتخب نہ ہوسکیں گے، یہاں تک کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں سے بھی منتخب نہ ہو پائیں گے۔

لکھنؤ معاہدے کی وجہ سے ہی مسلم لیگ اور کانگریس ایک پلیٹ فارم سے برطانوی سامراج سے لڑنے کے لیے متحد ہوئے۔ حقیقتاً محمد علی جناح اور مسلم لیگ ہی اس کامیابی کے حقدار ہیں جنھوں نے اتحاد کے لیے کوششوں کی ابتدا کی اور کانگریس نے اس کا مثبت جواب دیا۔ اس طرح محمد علی جناح کا کردار جوڑنے والے کا تھا نہ کہ علیحدہ کرنے والے کا اور یہی ان کی عوامی پہچان تھی۔

انھوں نے اپنی شخصیت کے اس اہم اور پیچیدہ کردار کوتقریباً ربع صدی تک نبھایا۔ یہاں تک کہ ایک ایساوقت آپہنچاجب تمام کوششوں کے باوجوداتحادسیاسی ضرورت نہ رہا۔

لکھنؤ معاہدہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کے مطالبات کوہی پیش نظرنہیں رکھتا بلکہ اس کے ذریعے سیاسی جماعتیں متحد ہوکر برطانوی حکمرانوں سے برسرِ پیکارتھیں اور مشترکہ مطالبات بھی کررہی تھیں کہ لیجسلیٹو کونسل میں منتخب ممبران کی اکثریت ہو۔جن میں ۴/۵ منتخب اور ۱/۵ نامزدممبران ہونے چاہئیں۔ نیز یہ کہ کونسل ممبران کو براہِ راست عوامی ووٹوں سے منتخب کیا جائے۔اس کے علاوہ یہ معاہدہ ایک ایساراستہ بھی تجویز کرتا تھا جس پر چل کرنوآبادیات مخالف آزادی کی جدوجہد متحد ہوکرلڑی جاسکتی تھی، اور ایسا ہی ہوا برصغیر میں انگریزوں کے نوآبادیاتی جبر کے خلاف آزادی کی جنگ میں کانگریس اور مسلم لیگی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان زنجیروں کوتوڑااور بیڑیوں کوکاٹا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ تو کیا مگر بار باراس بات کو واضح کیا کہ یہ مملکت تھیوکریٹک ہونے کے بجائے ایک سیکیولرمملکت ہوگی جس میں ہر مذہب کے ماننے والے کواپنے عقائد کے مطابق عبادت کی انجام دہی کا حق حاصل ہوگا۔ جب جناح صاحب نے پاکستان کے سیکیولرنظریہ کا اعلان کیاتو وہ مسلم لیگ کی اس نظریاتی بنیادی پوزیشن کو بیان کررہے تھے جواس تنظیم نے اپنی ساری تاریخ میں اپنائے رکھی۔

آج گلوبلائزیشن اورڈبلوٹی اوکوایک معاشی عفریت اورمغرب کی چال سمجھ کرہم اپنی معیشت کوفروغ نہیں دے سکتے۔اس سلسلے میں پاکستان کے معروف فلاسفرڈاکٹرمنظوراحمد نےتحریر کیا:

> ''اس ہمہ گیرحملہ کا مقابلہ کوئی مسلمان ملک تنہانہیں کرسکتا، اورنہ مذہبی احیاء کے بنداس سیلاب کوروکنے پرقادرہوسکتے ہیں۔ان کا مداوابھی اشتراکی طور پراس جمہوری روایت کے فروغ میں ہے جومسلمانوں کے اقداری نظام اورثقافت سے ہم آہنگ ہو۔ان مسائل پرمسلمان مفکرین نے صرف مدافعانہ انداز میں سوچا ہے اوراب تک قلعہ بند ہونے کے علاوہ ان کے پاس کوئی متبادل راستہ اس معاشی حملے سے بچنے کا نہیں ہے۔لیکن قلعہ بندی اس مسئلے کاحل نہیں ہے۔اس مسئلہ کاحل آپ

کے معاشی مفادات میں اشتراک سے ہی ممکن ہے اور یہ کام معاشی مفکرین اور منصوبہ سازوں کے کرنے کا ہے، جو اولاً اجتماعی غور و فکر کی ابتدا کریں اور معاشرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

حقیقتاً قائداعظم محمد علی جناح کا تصور یہ تھا کہ اسلام جمہوریت، عدل اور مساوات کی وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جو ایک جدید ریاست کی بنیاد ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ جدید اسلامی ریاست کے قوانین اور ادارے بعینہٖ وہی ہوں گے جو قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں نے وضع کیے تھے۔ اصلاحی اسلام کے علمبرداروں اور محمد علی جناح کے درمیان یہ تصور بعد میں ایک ایسی جدید ریاست کی تخلیق میں مسائل کا باعث ہوا جس کی بنیاد اُن اسلامی اقدار پر ہو، جو جناح صاحب کی اشتراکی سوچ میں تھے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی قائدانہ صلاحیتوں کا اظہار تحریک قیام پاکستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تحریک میں ان کی مدبرانہ شخصیت اور قائدانہ بصیرت ہی نے اتنے مشکل کام کو آسان بنا دیا اور 'پاکستان' کے نام سے ایک عظیم مملکت روئے زمین پر نمودار ہوئی۔ اسی لیے ایچ۔ وی ہڈسن نے اپنی کتاب ”دی گریٹ ڈیوائڈ“ میں تحریر کیا ہے:

”ہندوستان کے از سرِ نو آزاد ہونے والے عظیم ڈرامے کے آخری مرحلے میں جن شخصیتوں نے حصہ لیا ان میں محمد علی جناح بیک وقت سب سے زیادہ پراسرار اور سب سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ تصور تو کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامے کے دوسرے اہم کرداروں میں فلاں شخصیت کا بدل کوئی اور بھی ہو سکتا تھا یا فلاں مفاد یا طبقہ کی ترجمانی فلاں کے بجائے فلاں صاحب بھی کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ آخری وائسرائے کا کردار بھی کوئی اور بخوبی ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس ڈرامے کا انجام بہر حال مختلف نہ ہوتا اور یہ تصور ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ محمد علی جناح کی شخصیت اور قیادت کے بغیر واقعات یہ رخ اختیار کریں گے، اور حصولِ آزادی کے لیے آخری پنجہ آزمائی دو برابر کے حریفوں کے بجائے تین فریقوں میں ہوگی اور پاکستان کی نئی قوم اور ریاست معرضِ وجود میں آئے گی۔“

جس طرح قیام پاکستان کے لیے ان گنت جانوں کی قربانی کی ضرورت تھی، اسی طرح

استحکام پاکستان کے لیے محنت، لگن اور مسلسل جدوجہد درکار تھی اور یہ قربانی قائداعظم اوران کے پراعتماد ساتھیوں نے دی۔ قائد نے قیام پاکستان کے بعد مسلمانانِ ہند میں ایک قومی جذبہ بیدار کردیا، جس کے سامنے بندوقوں اور توپوں سے لیس برطانوی سامراج نہ ٹھہر سکا اوراس نے قائد کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا، جس کا اعتراف کرتے ہوئے گاندھی جی کو بھی کہنا پڑا:

''قائداعظم بلاشبہ اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے۔ وہ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر تھے، جہاں کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی طعنہ انھیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔''

قائداعظم کی کوشش تھی کہ ابتدا ہی میں ایسا لائحہ عمل بنالیا جائے جس پر چل کر ملکی ترقی کی راہوں کی نشاندہی آسانی سے ہو سکے اور نوزائیدہ مملکت ترقی کے منازل آسانی سے طے کر سکے۔ اس لیے جن امور پر قائداعظم نے خصوصی اور فوری توجہ دی ان میں:

- ☆ مہاجرین کی جلد آبادکاری
- ☆ سرکاری افسران کو خادمانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین
- ☆ نسلی وصوبائی تعصب سے گریز
- ☆ پاکستانی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین
- ☆ خارجہ پالیسی اور حکمت عملی کا تعین
- ☆ نوجوانوں کو تعلیم کی اہمیت پر زور دینا

مہاجرین کی جلد آبادکاری کے لیے انھوں نے کراچی اور لاہور میں بہ نفس نفیس دلچسپی لی اور ہندوستان سے آنے والے تقریباً ۸ لاکھ لٹے ہوئے قافلوں کی رہائش اور خوراک کے بندوبست کا جائزہ لیا، قائداعظم ریلیف فنڈ قائم کیا اور صاحبِ ثروت حضرات سے اپیل کی کہ وہ اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کی مالی امداد فرمائیں۔ اس دوران ۳۰، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے ایک جلسے میں آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اب یہ ہم پاکستانیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لاکھوں تباہ حال مہاجرین جو اپنا سب کچھ بھارت میں چھوڑ کر پاکستان آرہے ہیں، ان کی ہر ممکن امداد کی جائے، انھیں یہ مصیبتیں اس لیے سہنا پڑیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ شہریوں سے

اپیل کی کہ وہ نہایت صبر سے کام لیں اور ہر لحاظ سے اپنے مہاجر بھائیوں کی آبادکاری میں حکومت کی مدد کریں۔"

آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کے عوام نے آبادکاری میں بھرپور حصہ لیا اور مہاجرین کی امداد کے لیے ریلیف فنڈ میں فراخدلی سے چندہ دیا۔

قائداعظم نے سرکاری افسران سے حاکمانہ رویے کے بجائے خادمانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ ۲۵، مارچ ۱۹۴۸ء کو سرکاری افسران سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"آپ کو قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ آپ کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت برسرِ اقتدار آسکتی ہے، مگر آپ کا رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو احساس ہو کہ آپ حکمران نہیں، قوم کے خادم ہیں۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اگر آپ میری نصیحت پر عمل پیرا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ عوام کی نگاہ میں آپ کا مقام اور مرتبہ بلند ہوگا۔"

قائد کے ارشادات کا افسران اور اہل کاروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے رات دن ایک کر کے پاکستان کو ابتدائی بحران سے نکالا اور مہاجرین کی آبادکاری کو آسان بنایا۔

نسلی اور صوبائی تعصب اور اختلافات کو محسوس کرتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے ۱۵، جون ۱۹۴۹ء کو اپنے خطاب میں فرمایا:

"اب ہم پاکستانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بلوچی، پٹھان، سندھی، بنگالی اور پنجابی نہیں بلکہ سب پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور ہمارا عمل ایک پاکستانی کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔"

آپ نے صوبوں کا دورہ کیا، عوام کو خوش آئند مستقبل کی نوید سنائی، کراچی کو دارالخلافہ بنایا اور ریاستوں کی پاکستان میں شمولیت کو یقینی بنایا۔

پاکستانی معیشت کو مستحکم بنانے کے لیے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا اور مستقبل کے مجوزہ نظام سے متعلق اپنے خطاب میں فرمایا:

''مغربی معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاتعداد نا قابلِ حل مسائل کھڑے کردیے ہیں۔ مغربی طرز کا معاشی نظام ہمارے ملک میں خوشحالی اور ترقی نہیں پیدا کرسکتا۔ اس لیے ہمیں اپنی بہبود کے لیے کوئی نیا طریقہ وضع کرنا ہوگا اور دنیا کو ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہوگا جس کی بنیادیں اسلامی مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوں۔ ایسا کرنے سے ہم مسلمان قوم کی حیثیت سے دنیا کو ایک ایسا معاشی نظام دینے میں کامیاب ہو جائیں گے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن کا پیغام بن کر آئے گا۔ یاد رہے کہ امن ہی سے انسانیت کی بقا اور خوشحالی قائم رہ سکتی ہے۔''

قائداعظم نے قیام پاکستان کے فوراً بعد اسے اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی طرف بھرپور توجہ دی۔ ان کی ہدایت پر کم مدت میں بہت سے ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ خارجہ پالیسی میں بنیادی بات عمومی طور پر تمام ممالک سے اور خصوصی طور پر ہمسایہ ممالک سے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کا قیام تھا۔

قائداعظم کسی بھی معاشرے میں نوجوانوں کی تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اس لیے کہ وہی کسی ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ پشاور میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس بارے میں فرمایا:

''نوجوانوں کو اپنی تمام تر توجہ حصول علم پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں طلباء نے جو اہم کردار ادا کیا، میں اس کی تعریف کرتا ہوں مگر طلباء کو اب احتجاجی سیاست سے کلیتاً گریز کرنا ہوگا۔ اسی میں پاکستان کی بقا اور خوشحالی ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح، حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے معیارِ مومن پر سو فیصد پورے اترتے تھے۔ علامہ معیارِ مومن یہ بتاتے ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

سقراط نے موت کی سزا سننے کے بعد اپنی پیشین گوئی اور ہدایات میں منصفوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''اے منصفو! تم نے مجھے موت کی سزا سنادی ہے اور چونکہ اب میں مرنے والا ہوں اور موت کے حضور انسان میں نبیوں کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں تو مجھے یہ پیش گوئی کرنے دیجیے کہ میری موت کے بعد تم کو اس سے بھی بڑی سزا ملے گی، جو تم نے مجھے دی ہے...... تمھارے لیے سب سے آسان اور سب سے زیادہ قابل عزت راستہ دوسروں کو تہ تیغ کرنے کا نہیں بلکہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کا ہے۔''

قائداعظم نے بھی ملک وقوم کی خاطر مسلسل غور وفکر اور محنت کر کے اپنی زندگی کے اس زمانے میں ٹی بی جیسے موذی مرض کو گلے لگالیا مگر قوم کو بہتر بنے اور پاکستان کو شاد و آباد رہنے کی دعائیں دیتے رہے۔

اس طرح قائداعظم نے اپنی پوری زندگی تشکیل پاکستان سے تکمیل کی طرف رہبری میں خرچ کر دی۔ اور ۱۱، ستمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کیا۔ آپ کے انتقال پر پیتھک لارنس نے یہ حقیقت پر مبنی بات کہی کہ:

''گاندھی ایک قاتل کے ہاتھوں مارا گیا لیکن جناح نے پاکستان سے گہری وابستگی اور لگاؤ کی راہ میں جان دی۔''

•••

# سیکولر جمہوریت......قائد کا تصور

مسلم شمیم

قائداعظم محمد علی جناح بیسویں صدی کی چند اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے جنھوں نے صرف تاریخ میں ایک خاص منصب اور مقام حاصل نہیں کیا بلکہ تاریخ کے دھاروں کو نئی سمت عطا کی اور اس طرح نئی تاریخ تحریر کی اور تاریخ ساز شخصیت کہلانے کا استحقاق حاصل کیا۔ پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کا ظہور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کی جس طور اور جس چابکدستی سے انھوں نے قیادت کی اس کی کوئی نظیر نہیں ڈھونڈی جاسکتی۔ بیسویں صدی میں آزادی حاصل کرنے والے ملکوں کی ایک بڑی تعداد ہے مگر کسی نئی مملکت کے ظہور کی صرف دو مثالیں ہیں یعنی اسرائیل اور پاکستان۔ پاکستان کی تحریک غیر منقسم ہندوستان میں بسنے والی مسلم آبادی کے لیے ایک علیحدہ وطن کے حصول کی تحریک تھی جہاں ان کا مستقبل روشن ہو اور ان کے اقتصادی اور سیاسی مفادات کا تحفظ یقینی ہو۔ یہاں یہ واضح کرنا بے محل نہ ہوگا کہ پاکستان کی تحریک کوئی مذہبی تحریک نہ تھی اور نہ مسلم لیگ کوئی مذہبی تنظیم تھی۔ پاکستان کی تحریک خالصتاً سیاسی تحریک تھی جس کے پسِ پشت اقتصادی محرکات کی کارفرمائی تھی یہی وجہ ہے کہ برِصغیر کے مسلم عوام نے ایک جدید جہد فکر و ذہن رکھنے والے قائد کی قیادت قبول کی اور اسی کے ساتھ مذہبی قیادت کو مسترد کیا۔ اس وقت کی مذہبی قیادت تصورِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کی مخالف تھی۔ مذہبی قیادت کرنے والے علماء بھی غیر معمولی شہرت وعظمت کے حامل تھے مگر مسلم عوام کو ان کی فکر اور ان کی رہنمائی قبول نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم عوام کسی مذہبی ریاست کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ ایک ایسی ریاست کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جو جدید تقاضوں اور عصری نظریات پر استوار ہوتا کہ وہاں انھیں ایک خوشحال اور ترقی یافتہ معاشرتی زندگی کے لیے

سازگار حالات اور مواقع میسر ہوں۔ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کے اگر لوگ طالب ہوتے تو قائداعظم کی قیادت کی قبولیتِ عام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ قائدِ اعظم کی شعوری آبیاری اور تربیت مغربی درسگاہوں میں ہوئی تھی اور وہ مغرب کے نظامِ سیاست وحکومت کے دلدادہ اور علمبردار تھے۔ مسلم عوام کے سامنے قائداعظم کی فکری شخصیت نہ تو پوشیدہ تھی اور نہ مسلم عوام ان کے کوائف سے بے خبر تھے۔ قائداعظم اپنی تمام تر فکری زندگی، اپنے رویوں اور رجحانات کے ساتھ مسلم عوام کے مقبول ترین رہنما تھے۔ انھوں نے کبھی مذہبی لبادہ نہیں اوڑھا اور اپنی زندگی اور اپنے رہن سہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ وہ ایک ماڈرن دنیا کے ماڈرن بیرسٹر، سیاست کار اور ہر دلعزیز قائد تھے۔ ان کی خوش لباسی جو تمام تر مغربی خصوصیات سے عبارت تھی لوگوں کو بھاتی تھی بلکہ ان کے تمام قریب ترین ساتھی اپنے قائد کے نقش قدم پر چلنا اور جدید رویوں اور نظریات کا اپنی زندگی میں عمل دخل رکھنا قابلِ فخر تقلید جانتے تھے۔ غرض یہ کہ پاکستان ایک جدید جمہوری ریاست کے طور پر مسلم عوام کا بھی خواب تھا اور قائدِ اعظم کا بھی۔

قائدِ اعظم کے ان خیالات اور نظریات کے سلسلے میں درج ذیل دو اقتباسات یعنی قائدِ اعظم کے ارشادات خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

"What are we fighting for? What are we aiming at? It is not for a theocracy, nor for a theocratic state. Religion is there and Religion is dear to us all. The wordly goods are nothing to us when we talk of Religion but there are other things which are very vital.Our social, our economic life."

(An extract from the address to the Muslim Legislators Conference at Delhi in 1946)

"'The new state' would be a modern democratic state with Sovereignity resting in the people and the members of the new nation having equal rights of citizenship

regardless of their religion, cast or creed."

(An extract from an interview given to reuters correspondence in Delhi in 1946 [from 'Jinnah to Zia', p.29]

قائداعظم کی شخصیت اور کردار کا جائزہ لینے کے لیے بیسویں صدی کا طائرانہ مطالعہ کرنا میرے نزدیک ناگزیر ہے کیونکہ بیسویں صدی کے تناظر میں قائداعظم کی تاریخ ساز شخصیت کی بہتر تفہیم ممکن ہے۔ گزری ہوئی صدی کی دہائیاں میرے نزدیک صدیوں پر بھاری کہی جاسکتی ہیں۔ گزشتہ صدی جو ماضیِ قریب میں تاریخ کا حصہ بن گئی اس اعتبار سے تاریخ کی اہم ترین صدی کہی جائے گی کہ دو عالمی جنگوں کی ہولنا کیوں، ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہ کاریوں اور متعدد بین الاقوامی جنگوں کے حوالے سے جہاں اس صدی کا تاریخ میں منصب متعین کیا جائے گا وہاں ان سائنسی ایجادات اور دریافتوں کے حوالے سے اس صدی کی قدر و قیمت کا جائزہ بھی لیا جائے گا جن ایجادات اور دریافتوں نے انسانی تہذیب و تمدن کو نئی رفعتیں اور بلندیاں بخشیں۔ چاند کی سرزمین پر ابنِ آدم کا نقشِ پا اور دیگر سیاروں کی سمت عزمِ سفر و تسخیر تہذیبِ انسانی کے عروج کے لامتناہی سلسلے کی نشاندہی کرتا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری پانچ دہائیاں خصوصیت کے ساتھ غیر معمولی تبدلی اور ترقی کی دہائیاں تھیں۔ میرے خیال میں دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ صنعتی انقلاب کے بطن سے ایک نیا انقلاب سائنسی، تکنیکی انقلاب (S.T.R) بن کر ظہور پذیر ہوا جس نے کرۂ ارض کی ہیئت پر کئی اعتبار سے اپنے اثرات مرتب کیے اور سائنسی معجزوں نے انسانی بصیرت و بصارت کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر کردیں۔ اطلاعات کے شعبے میں جو ترقیاں اور تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ خود ایک جداگانہ انقلاب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس اطلاعاتی انقلاب (INFORMATION REVOLUTION) نے واقعتاً کرۂ ارض کو ایک GLOBAL VILLAGE میں تبدیل کردیا اور خواب گاہوں میں وہ سہولتیں میسر آگئیں کہ دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہونے والے واقعات و سانحات کا LIVE مشاہدہ کرنا ممکن ہوگیا اور انٹر نیٹ کے وسیلے سے علم و ادب، سائنس اور فلسفے اور معلومات کے ان خزانوں تک رسائی حاصل ہوگئی جو پچھلی صدی تک انسان کے وہم و گمان میں بھی شاید نہ ہو۔ سائنسی معجزوں کی اس صدی میں دنیا کے سیاسی نقشے پر رونما ہونے والی تبدیلیاں بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں۔ اس صدی میں دنیا کے سیاسی افق پر رونما ہونے والے انقلابات میں تاریخ کا سب سے بڑا اور ہمہ گیر انقلاب یعنی

انقلابِ اکتوبر کا طلوع وغروب بھی اسی صدی کے حصے میں آیا۔ انقلابِ اکتوبر کے جلو میں اور زیرِ اثر تیسری دنیا کی آزادی کی تحریکوں کی کامیابی نے نو آبادیاتی نظام کی شکست وریخت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انقلابِ اکتوبر سے براہِ راست INSPIRE ہو کر کئی انقلابات رونما ہوئے جن میں ۱۹۴۹ء میں چین کا سوشلسٹ انقلاب، شمالی کوریا، ویت نام اور کیوبا میں برپا ہونے والے انقلابات بیسویں صدی کی تاریخ میں اہم ابواب کا درجہ رکھتے ہیں۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد بھی مذکورہ بالا ممالک میں سوشلسٹ نظام قائم ودائم ہے۔

بیسویں صدی کے سیاسی منظرنامے پر طائرانہ نظر ڈالیے تو یہ حقائق آپ پر منکشف ہوں گے کہ جہاں بیسویں صدی میں نو آبادیاتی نظام کی بیخ کنی ہوئی اور کرۂ ارض پر آزادی کی تحریکوں کو سرخ روئی حاصل ہوئی وہاں یہ بھی آپ پر عیاں ہوگا کہ وہ تمام ریاستیں بحرانوں اور شکست و ریخت سے دوچار ہوئیں جنھوں نے جمہوری آدرش سے روگردانی کی نتیجتاً نو آبادیاتی نظام سے آزادی ان ملکوں کے لیے آزادی موہوم بنی۔ ان ملکوں میں افریقا، لاطینی امریکا اور ایشیا کے اکثر نو آزاد ملکوں کے نام شامل ہیں۔ مسلم دنیا کے تو تمام ممالک اس زمرے میں شامل ہیں، ان میں پاکستان بھی شامل ہے بلکہ سرفہرست ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں صرف جمہوری نظام کو ثبات اور استحکام کی سند حاصل ہوئی اور جمہوری راستے پر گامزن ممالک اور اقوام ہی کامران و سرخ رو رہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان، پرتگال اور اسپین میں فسطائیت (FASCISM) نے وقتی طور پر ان ملکوں کو عالمی نقشے پر نمایاں کیا مگر چند عشروں میں ہی ان ممالک میں فسطائیت (FASCISM) کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور مذکورہ بالا ممالک خود کو جمہوری بنیادوں پر از سرِ نو استوار کر کے کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ واضح رہے کہ فسطائیت (FASCISM) آمریت کی بدترین شکل ہے اور جمہوریت کی نفی پر اس کی بنیاد استوار ہے۔ فسطائیت (FASCISM) کی ناکامی اس نظام میں جمہوری عمل اور جمہوری آدرش کی عدم موجودگی اور نفی کا منطقی نتیجہ تھی۔ جمہوری عمل سے انحراف اور جمہوری اداروں اور روایات سے روگردانی میرے نزدیک سوویت یونین کے انہدام میں فیصلہ کن اور اہم ترین عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی میں وہ ممالک اور اقوام کامیاب و کامران رہے جنھوں نے جمہوری آدرش کو مشعلِ راہ جانا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی عناصر اور تضادات کو سچ پوچھیے تو جمہوریت

کی پناہ گاہ میں پناہ ملی ہوئی ہے اوراس کی پردہ پوشی بھی ہورہی ہے۔ جمہوریت اپنی تمام خامیوں اورکوتاہیوں کے باوجود بہترین نظامِ سیاست وحکومت ہے جس کا نہ تو کوئی SUBTITUTE ہے اور نہ جس پر عمل درآمد کا کوئی SHORT CUT ہے کیونکہ کسی دوسرے نظام میں پُرامن اور قانون کے تابع کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جمہوریت کی خرابیوں کا علاج مزید جمہوریت کے ذریعے ہی ممکن ہے نہ کہ جمہوریت سے انحراف کے ذریعے۔

مسلم دنیا کے حوالے سے بھی بیسویں صدی کا ذکر کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔اس صدی میں پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے خاتمے پر عالمی سیاسی نقشے میں بڑی غیر معمولی تبدیلیاں آئیں۔ خلافتِ عثمانیہ شکست وریخت سے دوچار ہوئی جس کے زیرِ نگیں بیشتر مسلم ممالک تھے خصوصیت کے ساتھ عرب ممالک۔خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں ترکی جو یورپ کا "مردِ بیمار" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کمال اتاترک کی قیادت میں ایک جدید ترقی یافتہ اور توانا مسلم ملک کے طور پر ابھرا اور اس طرح ترک عوام ایک مجہول بادشاہت کے ساتھ رجعت پرستی اور پسماندگی کے اندھیرے سے باہر نکلے اور روشن خیالی، تعقل پسندی اور خردافروزی کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوئے اور سیکولر جمہوری ریاست کے شہری بنے۔کمال اتاترک پوری مسلم دنیا کے ایک عظیم انقلابی رہنما کے طور پر جانے اور مانے گئے اور عالمی سطح پر مسلم عوام کے لیے SOURCE OF INSPIRATION بنے اور ان میں ایک نیا اعتماد، نئی زندگی اور نئے عہد کے نئے امکانات کی راہ پر گامزن ہونے کا حوصلہ پیدا ہوا۔بیسویں صدی میں یوں تو متعدد مسلم قائدین پیدا ہوئے اور تاریخ میں ممتاز منصب کے حامل ٹھہرے لیکن ان میں انڈونیشیا کے ڈاکٹر احمد سوکارنو، مصر کے جمال عبدالناصر اور مملکتِ پاکستان کے بانی قائدِاعظم محمد علی جناح کے نام سرفہرست ہیں۔

بیسویں صدی کے تناظر میں برصغیر پاک وہند میں ہونے والی تبدیلیاں اور آزادی کی تحریک تاریخِ عالم کا ایک اہم ترین باب ہے۔انیسویں صدی کے اواخر میں سرسید احمد خان کی قیادت میں علی گڑھ تحریک کی نوعیت اور حیثیت ایک مکمل نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کی تھی۔ سرسید کی تحریک کو ملاؤں اور رجعت پرست حلقوں کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور سرسید احمد خان کو کفر کے فتووں سے بھی نوازا گیا اور نیچری کہا گیا مگر فتووں کی یورش ویلغار سرسید احمد خان کے جلو میں رواں دواں تعقل پسندی اور خردافروزی کے کاروانِ نو کی راہ نہیں روک سکی اور

برصغیر کے مسلمان جدید فکر و شعور اور سائنس کے علوم سے بہرہ ور ہوئے اور سائنسی فکر و شعور کی راہ پر گامزن مسلم آبادی کو سیاسی بصیرت کی روشنی بھی ہاتھ آئی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور چند ہی برسوں میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی بنیادیں استوار ہونا شروع ہوگئیں۔ برطانوی نو آبادیاتی نظام کے اربابِ حل عقد کو ہندوستان میں SERIOUS CHALLANGES کا احساس ہونے لگا اور انھوں نے برصغیر میں مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی علم بردار تحریکوں کا سنجیدگی سے نوٹس لینا شروع کیا۔ دوسری طرف مسلم آبادی کے مستقبل کے بارے میں جو لوگ سب سے پہلے فکرمند ہوئے ان میں سرسید احمد خان تھے۔ انھوں نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی اور اس پلیٹ فارم پر مسلم آبادی کو اکٹھا کرنے کی ٹھانی اور مسلم آبادی کے حقوق کے تحفظ کی منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور نئے تاریخی تناظر میں مسلم آبادی کے قومی تشخص کا نعرہ بلند کیا اور اس طرح وہ تحریک پاکستان کے مفکر اور محرکِ نو کہلانے کے منصب پر فائز ہوئے۔ سرسید احمد خان کا سیاسی کردار جو برطانوی نو آبادیاتی نظام سے وابستگی سے عبارت ہے اور جو یقیناً DISPUTED CONTROVERSIAL ہے اس سے قطع نظر سرسید احمد خان کی عظمت اور بڑائی کی جگہ مسلم ہے اور آج برصغیر ہندوپاک کا ہر باشعور مسلمان یہ بات تسلیم کرے گا کہ اگر سرسید احمد خان کی تحریک ناکام ہوتی اور رجعت پسندوں کی بالادستی قائم رہتی تو ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اور حیثیت افغانستان کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ بدتر ہوتی اور مسلمان آبادی برِصغیر میں اچھوت آبادی کا حصہ ہوتی اور جہل و پسماندگی کے اندھیروں میں ہر طرح کی بصیرت و بصارت سے محروم بھٹکتے ہوتے اور افغانستان کے طالبان کی طرح اسلام کے ایسے ایسے IMAGE کے علمبردار ہوتے جس کا آج کی دنیا میں کوئی RATIONALE تلاش کرنا بعید از قیاس ہوتا۔ سرسید احمد خان نے نئی فکر اور نئے شعور کی جو مشعل روشن کی اس کی روشنی پورے برصغیر میں پھیلتی گئی اور اس مشعل کی روشنی کو پھیلانے والوں کا ایک تسلسل پیدا ہوتا گیا۔ جسٹس سید امیر علی اس فہرست کا ایک بہت اہم نام ہے۔ آگے چل کر یہ مشعل علامہ اقبال کے ہاتھوں میں پہنچ کر مہرِ نیم روز بن گئی۔ ان کی افکار کی روشنی ان کی شاعری کے وسیلے سے پھیلتی گئی اور اردو شاعری جدید فکر و فلسفہ سے مالا مال ہوئی، بندۂ مزدور کو زبان ملی اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی کردار کی عریانیت علامہ کی شعری تخلیقات میں موثر انداز میں لوگوں

پر منکشف ہوئی۔ علامہ اقبال نے اسلام کے حوالے سے جو خیالات اور نظریات پیش کیے وہ افغانستان کے ملاؤں کے جامد اسلام سے قطعی مختلف تھے۔ وہ اسلام کو قانونِ ارتقاء کے تناظر میں دیکھنے کے قائل تھے جو سر سید احمد خان کی فکر کی اساس ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کی اہم ترین انگریزی تصنیف RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM ہے جس کے مطالعے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی اس تفسیر کی روشنی میں DYNAMIC ISLAM کی تصویر ابھرتی ہے نہ کہ جامد وساکت اسلام کی۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے غیر منقسم ہندوستان مختلف تحریکوں کی آماجگاہ بنا۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کا قیام اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن کے ایما اور اشاروں پر عمل میں آیا اور سبھی اکابر جو مسلم لیگ کے قیام میں پیش پیش تھے وہ حکومتِ برطانیہ کے وفاداروں بلکہ حلقہ بگوشوں میں تھے جن میں سر آغا خان اور نواب ڈھاکا سر سلیم اللہ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ مسلم لیگ کے قیام کے اغراض ومقاصد میں حکومتِ برطانیہ کے لیے مسلمانوں میں جذبۂ وفاداری کا فروغ اور حکومتِ برطانیہ کے استحکام کے لیے تحریک کا چلایا جانا سرفہرست تھا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے حکومتِ برطانیہ سے رجوع کرنا اور عرض داشت پیش کرنا بھی شاملِ فہرست تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام سے پہلے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا واقعہ ہندوستانی سیاسی فضا میں ارتعاش کا باعث بنا اور آخر کار ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم کالعدم قرار پائی مگر تقسیم بنگال کے واقعے نے برصغیر میں فرقہ وارانہ سیاست کی راہیں وسیع تر کر دیں۔ مسلم لیگ کے مطالبے پر انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء میں جو عام طور پر مورلے منٹو اصلاحات کے نام سے جانا جاتا ہے کے تحت فرقہ وارانہ سیاست کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے حکومتِ برطانیہ نے جداگانہ انتخاب کے حق کی منظوری دی۔ یہ وہ تاریخ مرحلہ ہے جب محمد علی جناح نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ پہلے انڈین نیشنل کانگریس شامل ہوئے اور پھر مسلم لیگ میں ان دونوں سیاسی جماعتوں کی قیادت کو متحدہ لائحہ عمل پروگرام پر متفق رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۱۶ء کا 'میثاقِ لکھنؤ' NOW PACT) جو مذکورہ دونوں جماعتوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کے سلسلے

کارنامہ تھا وہ محمد علی جناح کی کوششوں کا نتیجہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ 'میثاق لکھنؤ' کے CHIEF ARCHITECT تسلیم کیے گئے۔ وہ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے ایک ممتاز رہنما کے منصب پر فائز ہو گئے تھے اور اتحاد یکجہتی کے سفیر (AMBASSADOR OF PEACE) کے لقب سے انھیں عرصہ دراز تک یاد رکھا گیا۔ مسلم لیگ کو جو برطانیہ کے وفاداروں کی بنائی ہوئی حکومت کی ایک طفیلی جماعت سمجھی جاتی تھی محمد علی جناح نے ایک عوام دوست اور محبِ وطن سیاسی جماعت کا منصب واعتبار بخشا۔ وہ آغازِ سفر ہی سے ایک روشن خیال اور سیکولر نظریات رکھنے والے مقبول رہنما کی حیثیت سے عوام میں جانے اور مانے گئے یہی وجہ ہے کہ خلافت تحریک جو تقریباً ایک عشرے تک ہندوستانی سیاسی افق پر چھائی رہی اس کی انھوں نے ہم نوائی نہیں کی اور اس سے اپنا فاصلہ قائم رکھا۔ ہر چند کہ اس تحریکِ خلافت کی حمایت انڈین نیشنل کانگریس کر رہی تھی اور مہاتما گاندھی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ایک عرصے تک ہندو مسلم اتحاد کی یہ تحریک علامت بنی رہی تھی مگر قائداعظم کی بصیرت کہیے کہ اس تحریک کے کھوکھلے پن کو انھوں نے واضح طور پر دیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ ایک فرسودہ ادارے اور مجہول بادشاہت کے حق میں چلنے والی یہ تحریک ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک کی زیرِ قیادت خلافت کے خاتمے کے نتیجے میں اپنی موت آپ مرگئی۔ تحریکِ خلافت سے عدم دلچسپی ان کے سیکولر ذہن اور سیکولر سیاست کی اساس کہی جانی چاہیے۔

بیسویں صدی کے اہم واقعات میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی کامیابی کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا ابھرنا یعنی پاکستان کا قائم ہونا شامل ہے۔ پاکستان جو تقسیم ہند کے نتیجے میں ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بنا تھا کوئی چھوٹی یا غیر اہم مملکت نہ تھا بلکہ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار کے مطابق اور دنیا کے تمام ممالک کے تناظر میں آبادی کے اعتبار سے پانچواں ملک تھا اور مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک اور علاقے کے اعتبار سے بھی دنیا کے بڑے ممالک کی فہرست میں شامل تھا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان نہ تو دنیا کا پانچواں بڑا ملک رہا اور نہ مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک۔ آج سب سے بڑا مسلم ملک ہونے کا فخر انڈونیشیا کو حاصل ہے۔ پاکستان ۱۹۷۱ء میں جس المیے سے دوچار ہوا وہ براہِ راست محمد علی جناح کے اصولِ سیاست اور نظریۂ ریاست سے انحراف کا نتیجہ تھا۔ جناح صاحب قانون کی حکمرانی، دستور کی بالادستی اور جمہوری عمل کے داعی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنے مخصوص

سیاسی اور طبقاتی مفادات کے زیرِ اثر قائداعظم کے افکار و نظریات اور اصولِ سیاست سے انحراف کا راستہ اپنایا اور جموری اداروں کی تشکیل و استحکام کے بجائے اپنے ذاتی مفادات اور سیاسی مستقبل کی تعمیر و تشکیل کی روش اپنائی۔

قائداعظم نے ایک جدید جمہوری سیکولر ریاست کا خواب دیکھا تھا۔ ان کے ذہن میں وہی جدید سیکولر جمہوری پاکستان تھا جس کا بانگ دہل اپنے اس مشہور و معروف خطاب میں اعلان کیا تھا جو انھوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس خطاب کے علاوہ بھی بہت سے موقعوں، مرحلوں اور اپنی تقاریر میں انھوں نے پاکستان کے حوالے سے مذکورہ نظریۂ ریاست کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ پاکستان کوئی THEOCRATIC STATE نہیں ہوگا بلکہ ایک سیکولر جمہوری ریاست ہوگا جس کے شہری ہر اعتبار سے بغیر کسی تمیز و تفریق کے برابر کے شہری ہوں گے، جنھیں اس ریاست میں برابری کے حقوق حاصل ہوں گے۔ پاکستان کا ہر باشندہ یکساں پاکستانی شہری ہوگا خواہ اس کا کوئی مذہب اور مسلک ہو۔ پاکستان کے دستور ساز اسمبلی کے خطاب مورخہ ۱۱، اگست ۱۹۴۷ء سے اقتباس درج ذیل ہے:

"Now if we want to make this great state of Pakistan happy and prosperous we should wholely and solely concentrate on the well-being of the people and specially of the masses and the poor. If you will work in co-opertion, forgetting the past, burying the hatchet. You are bound to succeed. If you change your past and work together in a spirit that everyone of you, no matter to what community he blongs, no matter that relations he had with you in the past, no matter what is his colour, caste or creed, is first, second and last a citizen of this state with equal rights, privileges and obligations,

there will be no end to the progress you will make. I cannot emphasise it too much. We should begin to work in that spirit and in cource of time all these angularities of the majority and minority communities, the Hindu community because even as regards Muslims you have Pathans, Punjabis, Shias, Sunnis and so on, and among the Hindus you have Brahmins, Vishnavas, Khatris, also Bengalis, Madrasis and so on will vanish. Indeed, if you ask me, this had been the biggest hindrance in the way of India to attains its freedom and independence and but for this we should have been free peoples long ago. No power can hold another nation, and specially a nation of 400 Millions souls, in subjection; nobody could have continued its hold on you for any length of time but for this. Therefore, we must learn a lesson from this. You are free, to go to your temples, Mosques or you are free to go to your any other places of worship in this state of Paksitan. You may belong to any religion or caste or creed, that has nothing to do with the business of the state. As you know, history shows that in England conditions some time ago were much worse than those prevailing in India today. The Roman Catholics and the Protestants

persecuted each other. Even now there ae some states in existence where there are discriminations made and bars imposed against a particular class. Thank God we are not starting in those days. We are starting in the days when there is no discrimination between one community and another, no discrimination between one caste or creed and another. We are starting with this fundamental principle that we are citizens and equal citizens of one state. The people of England in course of time had to face the responsibilities and burdens placed upon them by the Government of their country and they went through that fire step by step. Today, you might say with justice that Roman Catholics and Protestants do not exists. What exists now is that every man is a citizen, an equal citizen, of Great Britain and they are all members of the Nation. Now, I think we should keep that in front of us as our ideal and you will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the Religious sense, because that is the personal faith of each individual but in the political sense as citizens of the state."

(An extract from the address to the Constituent Assembly of Pakistan on August 11th, 1947)

قائد اعظم ایک جمہوریت پسند تھے اور برطانوی پارلیمانی نظام کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا تھا اور اس کی عملی کارکردگی کا مشاہدہ بھی۔ برطانوی جمہوری نظام جس کا سفر ارتقا MAGNACARTA (یعنی ۱۲۱۵ صدی عیسوی کا آغاز) سے شروع ہوا تھا، کسی تحریری آئین نہ ہونے کے باوجود کرۂ ارض پر کامیاب ترین سیاسی نظاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تاریخی تناظر میں برطانوی جمہوریت کو MOTHER OF ALL DEMOCRACIES کہا جاتا ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کو MOTHER OF ALL PARLIAMENT۔ قائد اعظم کے جمہوری شعور کی تربیت میں برطانیہ میں دورانِ تعلیم ان کے قیام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ وہاں آئینی بادشاہت ہنوز قائم ہے مگر آئینی بادشاہت جمہوری عمل اور پارلیمنٹ کی بالادستی کی راہ میں کسی طور حائل نہیں ہے۔ برطانوی پارلیمانی نظام کی خصوصیات میں جہاں CABINET SYSTEM اور COLLECTIVE RESPONSIBILITY کے حوالے دیے جاتے ہیں وہاں RULE OF LAW کا حوالہ بڑی خصوصیت کا حامل گردانا جاتا ہے، قانون کی عمل داری اور قانون کی بالادستی کو جمہوریت کی روح جانا جاتا ہے۔ قانون کی عمل داری اور قانون کی بالادستی قائد اعظم کے سیاسی کمٹمنٹ کا سرچشمہ تھا۔ قانون کی بالادستی پر ان کا تعین اور ایمان ان کی جمہوریت پسندی پر دال ہے۔ ان کے سیکولر فکر اور نظریے کی بنیاد بھی قانون کی بالادستی پر استوار ہے۔ وہ کسی ایسے جمہوری نظام کا تصور نہیں کر سکتے تھے جہاں شہریوں کو مذہب، نسل و رنگ اور عقیدوں کی بنیاد پر تمیز و تفریق کا سامنا ہو۔ وہ تو جمہوریت کی روح EQUALITY, LIBERTY AND FRATERNITY کے ان تین لفظوں میں پنہاں اور متحرک جانتے تھے۔ یہ تین الفاظ جو ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کا نعرہ بنے تھے اور جس کے مصنف فرانسیسی مفکر روسو تھے جو بعد میں تمام جمہوری انقلابات اور تبدیلیوں کا منشور بنے تھے ان کی زندگی اگر وفا کرتی اور ان کی زندگی میں پاکستان کا دستور منظور ہوتا تو اس دستور میں صدر کے عہدے سے لے کر کسی بھی ریاستی منصب کے لیے مذہب کی بنیاد پر تمیز و تفریق کو روا نہیں رکھا جاتا اور اس طرح پاکستان کے تمام شہری خواہ ان کا مذہب اور عقیدہ کچھ بھی ہو ملک کے بنیادی قانون یعنی دستور کی نظر میں برابر کے شہری ہوتے اور کسی احساسِ کمتری سے دوچار نہ ہوتے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے پہلی فرصت میں ان کے سیکولر نظریۂ ریاست کی نفی، 'قراردادِ

مقاصد' کی منظوری کی صورت میں کی جو بعد کے دستوروں کا جزوِلاینفک قرار پائی۔ یہ 'قراردادِ مقاصد' ریاست کی سیکولر جمہوری روح اور ڈھانچے کے صریحاً خلاف ہے۔ اس قراردادِ مقاصد کو بعد میں رجعت پرست حلقوں نے پاکستان کو THEOCRATIC STATE بنانے کی تحریک کی اساس کی حیثیت دی۔ پاکستان کی تاریخ کے ۵۴ سال کا عرصہ TRAGEDIES, SETBACKS اور CRISES کے تسلسل کی تاریخ ہے۔ یہ سب کچھ قائدِ اعظم کے سیاسی مسلک، جمہوری طرزِ حکومت اور نظریہ ریاست سے روگردانی کا نتیجہ ہے، خاص طور پر مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا اس انحراف کا براہِ راست نتیجہ تھا۔ پاکستان اگر جمہوری نظام پر عمل پیرا ہوتا تو اس کے ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ جمہوری اصولوں کی پاسداری کا منطقی تقاضا تھا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کیا جاتا اور مرحوم شیخ مجیب الرحمان کی جماعت عوامی لیگ کو وفاقی حکومت کی ذمہ داری سونپ دی جاتی اور اگر ایسا کیا جاتا تو ملک اس المیے سے ہرگز دوچار نہ ہوتا۔ بھارت کی یکجہتی اور اتحاد کی ضمانت وہاں کا جمہوری نظام اور جمہوری ادارے ہیں۔ جنوبی ہند، آسام اور پنجاب کے بحرانوں سے بھارت کامیابی سے عہدہ برآ ہوتا رہا ہے، مستقبل میں بھی بھارت کسی شکست وریخت سے دوچار نہیں ہوگا کیونکہ ۵۴ سالہ عرصے میں وہاں جمہوری ادارے، جمہوری عمل اور جمہوری روایات مستحکم تر ہوئی ہیں اور اب وہاں کے جمہوری سیاسی ڈھانچے میں بڑے سے بڑے SHOCKS کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے برعکس پاکستان اس سفر میں ہنوز روزِ اول کے مرحلے سے دوچار ہے۔ چنانچہ "اسلام خطرے میں ہے اور پاکستان خطرے میں ہے" یہ نعرے آغازِ سفر سے آج تک اسی جوش وخروش سے بلند کیے جاتے ہیں۔ ۵۴ سالہ عرصۂ سفر میں جمہوری راستے سے انحراف کے نتیجے میں آج تک پاکستانی قومیت کی کوئی اساس استوار نہیں ہو پائی ہے۔ یہ احساسِ قومیت جمہوری عمل کی دین ہوتا ہے نہ کہ جبر واستبداد کی پیداوار۔ مختلف مرحلوں میں پاکستان کے عوام کو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور حقوق سے محرومی کا احساس اسی جمہوری عمل کے فقدان کا شاخسانہ کہا جانا چاہیے۔

پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ہونے والی جدوجہد اور تحریک جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہی شروع ہوچکی تھی جس کا سہرا مرحوم سرسید احمد خان کے سر ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد کے عشروں میں مسلم لیگ کی کارکردگی دیگر تحریکوں کے

مقابلے میں بہت کم موثر رہی۔ ۱۹۱۶ء میں 'میثاقِ لکھنؤ' جس کے CHIEF ARCHITECT محمد علی جناح تھے کے بعد کافی عرصے تک یہ تنظیم پس منظر میں رہی یا بے عملی کا شکار رہی یہی وجہ ہے کہ قائداعظم بددل ہوکر انگلستان چلے گئے تھے، گویا سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ مسلم لیگ ۱۹۳۰ء کے بعد دوبارہ MAIN STREAM میں آ گئی اور ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں علامہ اقبال کا خطاب مسلم اکثریتی صوبے کی علیحدہ خودمختار حیثیت کی طرف نشاندہی تھا۔ علامہ اقبال کا یہ خطبہ گویا مسلم لیگ کا نیا منشور ثابت ہوا اور مسلم لیگ کی قیادت کو پہلی مرتبہ اس کی منزل کی سمت کا شعور وادراک ہوا۔ اسی عرصے میں چودھری رحمت علی نے مجوزہ مملکت کا نام 'پاکستان' تجویز کیا جو جلد ہی زبان زدِ خاص و عام ہونا شروع ہوا۔ اس عرصے میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے درمیان خط و کتابت کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مسلم لیگ کی تحریک اس مرحلے میں اتنی موثر اور مقبول ہو چکی تھی کہ قائداعظم کو انگلستان سے وطن واپس بلانا ممکن ہوسکا اور اس طرح چند برسوں میں یہ تحریک ایک طوفان بنی اور دنیا کے نقشے پر پانچواں بڑا ملک ایک نئی ریاست کے روپ میں 'پاکستان' کے نام سے نمودار ہوا۔ سچ پوچھیے تو مسلم لیگ کو محمد علی جناح کی قیادت نے ہمہ گیر عوامی تحریک میں تبدیل کیا اور 'پاکستان' کے مطالبے کو مسلمان عوام کی ایسی پرجوش اور ہمہ جہت تائید اور حمایت حاصل ہوگئی کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے بھی قوموں کے حقِ خوداختیاری (RIGHT OF NATIONAL SELF DETERMINATION) اصولوں کے پیشِ نظر 'پاکستان' کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ یوں تو پاکستان کا قیام ایک باضابطہ تحریک کا نتیجہ تھا مگر اس تحریک کے سب سے بڑے اور موثر رہنما قائداعظم محمد علی جناح تھے اور اس تناظر میں انھیں مسلم عوام نے 'قائداعظم' کے لقب سے یاد کیا جو بعد میں ان کے نام کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کو بانیِ پاکستان کا منصب بلاشرکت غیرے حاصل ہوا اور 'بابائے قوم' (FATHER OF THE NATION) کی حیثیت سے تاریخ میں چند ناموں میں سے ایک ہیں۔ اس فہرست میں عالمی شہرت رکھنے والوں میں جارج واشنگٹن، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر احمد سوکارنو، چیئرمین ماؤزے تنگ، ہوچی منہ اور کمال اتاترک کی فہرست میں محمد علی جناح کا نام بھی شامل ہے۔ اگر زندگی نے ان کے ساتھ وفا کی ہوتی اور انھیں ایک عشرہ بھی پاکستان کی تعمیر، ترقی

کے لیے سرگرمِ عمل ہونے کا موقع مل گیا ہوتا تو پاکستان کی آج جو صورتحال یعنی حال خراب ہے وہ صورت قابلِ رشک ہوتی اور پاکستان کی تاریخ اس سے قطعی مختلف ہوتی اور یہ وہ تاریخ ہوتی جس پر ہر پاکستانی فخر کرسکتا تھا، پاکستان مسلم دنیا کا سب سے نمایاں ملک ہوتا اور تیسری دنیا کے ممالک میں بھی اس کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی۔ آج صورتحال کی خرابی کی وہ منزل ہے کہ یہاں طالبان کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ بالفاظِ دیگر محمد علی جناح کے پاکستان کے حوالے سے جتنے خواب تھے وہ پاش پاش کیے جاچکے ہیں اور پاکستانی قوم کو شر پسند عناصر کی دہشت گردی کا سامنا ہے معاشرہ INTOLERANCE کی گرفت میں ہے۔ پاکستان کے عوام کو جو نوید محمد علی جناح نے سنائی تھی کہ وہ ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری ہوں گے، جہاں سب کے حقوق یکساں ہوں گے، کسی شخص اور فرقے کو دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہ ہوگی، تمیز وتفریق سے بالاتر نظامِ قانون کی عمل داری ہوگی وہ نوید صدا بہ صحرا ہوگئی، عقیدے کی بنیاد پر تمیز وتفریق ORDER OF THE DAY ہے، آئے دن TARGETED KILLING کا بازار گرم ہے۔ اس دہشت گردی کے شکار ہونے والوں میں معاشرے کے لیے گراں قدر خدمات انجام دینے والی ہستیاں بھی شامل ہیں جن میں حکیم محمد سعید بھی شامل ہیں اور تازہ ترمقتولوں میں شوکت مرزا کا نام بھی شاملِ کشتگاں ہوگیا ہے۔ اقلیتوں کو احساس محرومی کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری ہونے کی ذلت کا احساس بھی ہے۔ اقلیتوں کا اصرار ہے کہ انھیں جداگانہ انتخاب کے ذریعے ملک کی اچھوت آبادی ہونے کے احساس سے نجات دلائی جائے اور JOINT ELECTORATE کے تحت انھیں حقِ رائے دہی دیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں کی تحریک اور مطالبے پر انھیں ۱۹۰۹ء کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت جداگانہ حقِ انتخاب دیا گیا تھا تاکہ ان کے حقوق کو تحفظ حاصل ہوسکے اور مختلف اداروں میں ان کی نمائندگی کو آبادی کے تناسب سے یقینی بنایا جاسکے۔ پاکستان میں اقلیتوں کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جداگانہ حقِ انتخاب کے لیے آبادی کے تناسب سے نمائندگی کے حصول میں معاون ہے یا نہیں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے، انھیں معاشرے میں تمیز وتفریق (DISCRIMINATION) کا سامنا ہے اور وہ اس احساسِ ذلت سے خود کو آزاد کرانا چاہتے ہیں مگر ہمارے اربابِ حل وعقد کو اس باب میں نہ جانے کون سے کفر والحاد کے مسائل کا سامنا ہے کہ وہ جداگانہ انتخاب کے جوئے

سے اقلیتوں کو آزاد نہیں کرنا چاہتے۔ اقلیتوں کی طرف سے JOIN ELECTORATE کی حمایت میں تحریک ماضیِ قریب میں منعقد ہونے والے لوکل باڈیز کے انتخابات میں بائیکاٹ کے مرحلے تک پہنچی تھی۔ سنا گیا ہے کہ اس ضمن میں بھی حکومتِ وقت کو مذہبی حلقوں اور جماعتوں کی مخالفت کا سامنا ہے۔ مذہبی حلقے اور جماعتیں اسے بھی کفر و اسلام کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں JOINT ELECTORATE کا نفاذ نظریۂ پاکستان کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ 'نظریۂ پاکستان' کی اصطلاح بقول مرحوم جسٹس منیر (حوالہ: FROM JINNAH TO ZIA) ۶۰ء کی دہائی میں سب سے پہلے سنی گئی۔ اس سے قبل نظریۂ پاکستان کی اصطلاح سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ یہ اختراع اس جماعت کا کارنامہ ہے جو تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کی مخالف رہ چکی تھی۔ ۶۰ء کی دہائی سے یہ اصطلاح اس قدر دہرائی گئی ہے کہ نظریۂ پاکستان کی اہمیت خود پاکستان سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ وہ مذہبی جماعتیں جو سرے سے قیامِ پاکستان کی مخالف تھیں وہ قیامِ پاکستان کے بعد اس پاکستان کے خدوخال کو مسخ کرنے میں سرگرمِ عمل ہوگئیں اور اب تک مصروفِ عمل ہیں۔ قائدِ اعظم جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ پاکستان کو ایک جدید جمہوری مسلم ریاست کی حیثیت سے اقوامِ عالم میں ایک ممتاز مقام دلوانے کے خواہاں تھے۔ اگر قائداعظم کی زندگی کچھ اور سال وفا کرتی تو پاکستان مسلم دنیا کا دوسرا ترکی بن کر پاکستانی عوام کے لیے ترقی اور خوشحالی کا گہوارہ بنتا۔ ترکی جو ''یورپ کا مردِ بیمار'' سے ایک توانا جدید ملک بنا، پاکستان بھی ایشیاء کے خوشحال ترین اور ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ ماضی کی حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت بھی ان مذہبی حلقوں اور جماعتوں کی STREET POWER سے خائف ہے اور کوئی ایسی حکمت عملی اپنانے جس سے عوام کو افلاس، جہل اور پسماندگی سے نجات ملے، سے گریزاں ہے۔ موجودہ سربراہِ حکومت نے اپنی کئی تقریروں میں بڑی روشن خیالی کی باتیں کی ہیں مگر ان کے تمام ارشادات اب تک صدا بہ صحرا ہیں اور حکومت کی کسی منصوبہ بندی اور پالیسی میں اس کا کوئی اظہار نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں 'سیرت کانفرنس' میں کی جانے والی تقریر کی صدائے بازگشت ملک کے اخبارات میں کچھ عرصے ضرور سنی گئی مگر تقریر کی لذت سے آگے کوئی بات نہیں بنی۔ یہ مذہبی جماعتیں جن کی STREET POWER سے حکومتیں خائف رہی ہیں عوام نے ہمیشہ انھیں مسترد کیا اور انتخابات جب بھی

ہوئے انھیں پارلیمنٹ کی چند نشستیں بھی حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرا۔ حکومت اگر عوام پر بھروسا کرے اور جمہوری اداروں کو مستحکم کرے تو یہ مشکل آسان ہوسکتی ہے اور STREET POWER کا بھرم اور خوف معدوم ہوسکتا ہے۔ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کی عدم موجودگی کے نتیجے میں ایسی طاقتیں سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ جمہوری عمل جمہوری ادارے اور روایات قائداعظم کے آدرش کا محور و مرکز تھیں جسے نظرانداز کر کے رجعت پرست رویوں اور رجحانات کو پھلنے پھولنے کے موقع فراہم کیے گئے اور پاکستان کے حوالے سے بانی پاکستان کے نظریات اور اہداف کو یکسر پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ جن بحرانوں سے ملک آج بھی دوچار ہے ان بحرانوں سے نپٹنے کے لیے ہمیں قائداعظم کے نظریات و افکار سے رجوع کرنا چاہیے، ان اصولوں اور راستوں کو جنھیں فراموش کر دیا گیا ان پر عمل پیرا اور گامزن ہونے کی تدبیر کرنی چاہیے۔

قائداعظم ایک روشن خیال جمہوریت پسند رہنما تھے۔ ان کے خوابوں کی تعبیر اس ملک کو جدید جمہوری خطوط پر تعمیرِ نو اور تشکیلِ نو میں پوشیدہ ہے۔ اس باب میں ان کے خیالات اور ہدایات نہایت غیر مبہم ہیں۔ موجودہ عوام دشمن قوتوں اور رجعت پرست طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے قائداعظم کے افکار و نظریات کو بروئے کار لایا جانا چاہیے کیونکہ رجعت پرست طاقتوں کو اب بھی کھلم کھلا قائداعظم کے افکار و نظریات کو مسترد کرنے کا حوصلہ نہیں ہوسکتا اس لیے کہ عوام کے دلوں میں قائداعظم کے لیے آج بھی وہی احترام ہے جو نصف صدی پہلے تھا۔ بانی پاکستان اور بابائے قوم جس منصب پر فائز ہیں اس منصب کو آج بھی کسی حلقے سے چیلنج کا سامنا نہیں ہے۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصورِ قیادت

خواجہ رضی حیدر

بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح تدبر اور فراست کا مجسمہ تھے۔ آپ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ آپ جو اقدام کرتے اس پر پہلے اچھی طرح غور وفکر کر لیتے تھے، اس کے بعد اسے عملی صورت دیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران متعدد مراحل پر آپ نے فیصلے میں تاخیر کا مظاہرہ کیا جس سے جزوی طور پر مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوئی لیکن جب آپ نے فیصلے کا اعلان کیا تو ہر شخص نے آپ کے تدبر اور فراست کی داد دی۔ خصوصاً 1928ء میں نہرو رپورٹ کے موقع پر آپ کی طویل خاموشی تشویش کا باعث تھی۔ اکتوبر 1928ء میں انگلستان سے واپسی پر جب آپ سے اخباری نمائندوں نے اس رپورٹ پر اظہارِ خیال کے لیے کہا تو آپ نے رپورٹ پر تبصرہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی مجھے اس رپورٹ کے تفصیلی مطالعے کا وقت نہیں ملا ہے۔ لیکن آپ نے اس موقع پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ پریشان نہ ہوں اور متحدہ رہیں، کیونکہ مسائل حل ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پھر 31 ردسمبر 1928ء کو کلکتہ کے مقام پر کل جماعتی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے آئینی اور قانونی طور پر نہرو رپورٹ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور واضح طور پر کنونشن سے کہا:

> ''نہرو رپورٹ کو جناح کی تائید کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تائید کی ضرورت ہے۔ اگر اقلیتوں کا مسئلہ آپ نے آج حل نہیں کیا تو لازماً اسے کل حل کرنا پڑے گا۔ ہندو اور مسلمان اسی ملک کے باشندے ہیں، اگر ان کے درمیان باہمی اختلافات ہیں بھی تو ان اختلافات کی وجہ سے دشمنی اور عداوت مول نہ لیجیے۔ اگر وہ باہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمنوں کی مانند ایک

دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی ایک بڑی آرزو ہے۔ اس اتحاد کے راستے میں کسی منطق، ناانصافی اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجیے۔

قائداعظم کی اس دردمندانہ اپیل کے باوجود کانگریس کی ہندو قیادت نے قائداعظم کی ترامیم کو مسترد کرتے ہوئے نہرو رپورٹ کی جس میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اس کی منظوری دے دی۔

مسلمانوں کے مسائل اور مطالبات کے سلسلے میں ہندو قیادت کا رویہ ہمیشہ ہٹ دھرمی اور ناانصافی پر مبنی رہا جس کی بنا پر مسلمانوں کے ہاں یہ خیال تقویت پکڑتا چلا گیا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ مسلم ریاست تشکیل دینا پڑے گی۔ کل جماعتی کنونشن سے واپسی پر قائداعظم نے اپنے ایک دوست سے فرمایا: ''آج ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا اس طرح جدا ہو رہے ہیں کہ وہ آئندہ کبھی باہم متحد نہیں ہوں گے۔'' قائداعظم کا یہ تجزیہ ایک پیشین گوئی ثابت ہوا اور مارچ 1940ء میں مسلمانانِ ہند نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ نہ صرف پیش کیا بلکہ اس مطالبے کی منظوری کے لیے من حیث القوم کو وقف کر دیا۔ قائداعظم نے اپنے تجربے کی روشنی میں ہمیشہ کانگریس کو ایک ہندو جماعت قرار دیا اور کانگریس بھی برابر اپنے ہندو جماعت ہونے کا ثبوت فراہم کرتی رہی۔ قائداعظم نے اسی مطالبے کی روشنی میں جون 1940ء میں وائسرائے ہند سے واضح طور پر کہا کہ آئندہ جو بھی دستوری خاکہ مرتب کیا جائے اس میں دو خودمختار آزاد ریاستوں کا اصول شامل کیا جائے۔'' اسی اصول کی بنیاد پر قائداعظم نے مارچ 1946ء میں وزیراعظم برطانیہ کو ایک خط میں لکھا کہ ''ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام چاہتے ہیں اور یہی ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے۔''

بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے حصولِ پاکستان کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کی مرحلہ وار سیاسی تربیت کی۔ اگر ہم آپ کی 1937ء سے 1947ء تک کی سیاسی زندگی کو دیکھیں تو ہمیں آپ کی تقاریر و بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہوئی نظر آئے گی کہ قائداعظم کے ذہن

میں ابتدا ہی سے مسلمانوں کی آخری منزل تھی۔ 1934ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ازسرِ نو صدارت سنبھالنے کے بعد نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی بلکہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ متحد ہو جائیں اور کسی حتمی لائحۂ عمل کے لیے تیار رہیں۔ فروری 1936ء میں آپ نے لاہور میں ایک تقریر کے دوران مسلمانوں سے کہا:

''میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ سکون اور امن سے رہیں اور میری کوششوں میں مجھ سے تعاون کریں تاکہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ آپ کی خدمت کر سکوں۔''

مارچ 1937ء میں صوبائی انتخابات کے موقع پر آپ نے ایک بیان میں فرمایا:

''مسلمان سرِ دست غیر منظم اور بے یار و مددگار ہیں لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ مسلم لیگ ان کو منظم کر رہی ہے تاکہ وہ انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکیں۔''

اپریل 1937ء میں آپ نے فرمایا: ''ہم کانگریس سے برابری کی بنیاد پر تعاون کے لیے تیار ہیں لیکن ہم کسی کی حاکمیت اور بالادستی قبول نہیں کریں گے۔'' 1937ء میں ہی آپ نے فرمایا:

''اس وقت پورے ہندوستان میں مسلم یکجہتی کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ قومی اُصولوں پر یقین رکھتی ہے اس لیے وہ اجتماعی جدوجہد کے ذریعے مسلم حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔''

فروری 1940ء میں آپ نے اینگلو اورینٹل کالج دہلی میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:

''جب میں یہ محسوس کروں گا کہ مسلمان جدوجہد کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں تو پھر میں ان کو آگے بڑھنے کا حکم دوں گا۔''

مارچ 1940ء میں علیگڑھ کے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''کسی پر بھی انحصار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم کو اپنی قوت پر انحصار کرنا ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح کی مسلسل حوصلہ افزائی اور سیاسی تربیت کے نتیجے میں مسلمانوں نے 23/مارچ 1940ء کو ایک علیحدہ خود مختار مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ بعد میں یہ مطالبہ ''مطالبۂ پاکستان'' کے نام سے معروف ہوا اور اس مطالبے کو منظور کرانے کے لیے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ 3/نومبر 1940ء کو قائداعظم نے ممبئی میں ایک اجتماع

سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”مجھے اُمید ہے کہ مسلمان یہ بات ذہن نشین کرلیں گے کہ وہ اقلیت نہیں ہیں، وہ ایک قوم ہیں اوراس لحاظ سے ہمارا ایک علاقہ، ایک علیحدہ ملک ہونا چاہیے۔“

دسمبر 1940ء میں ممبئی ہی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”کسی بھی فرقہ یا قوم کی طاقت کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے: تعلیم، ترقی یافتہ تجارت اور شجاعت۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان اوصاف سے خود کو لیس کرلیں۔“

3رجنوری 1941ء کو آپ نے فرمایا:

”میں نے آج تک پاکستان کے خلاف کوئی ٹھوس دلیل نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے ہندوستان کی فضا اور صورتِ حال مزید بہتر ہو جائے گی۔“

مارچ 1941ء میں کانپور میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”پاکستان کا قیام بہت ضروری ہے۔ اس بات پر جس قدر اصرار کیا جائے وہ کم ہے۔“

جنوری 1942ء میں کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”گزشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمانوں نے بہت کچھ کھویا اور سختیاں برداشت کیں۔ لیکن اب کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لینے کا وقت آ گیا ہے۔ وقت ہمارے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے گا۔“

تحریکِ پاکستان کی عظیم ترین جدوجہد میں کامیابی کے بعد پاکستان کا حصول جہاں بانیِ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا وہیں اس بے مثال قومی یکجہتی کا بھی مظہر تھا جس کی تعلیم قائدِاعظم اپنی قوم کو مسلسل دیا کرتے تھے۔ آپ نے بار بار مسلمانوں سے فرمایا کہ ہماری نجات ہمارے مکمل اتحاد، باہمی اتفاق اور نظم وضبط میں ہے، ہم امنِ عالم کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی تمام اقوام کے لیے بہت دوستانہ ہوگی۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی منظّم قوم کے درست فیصلے کی مزاحمت نہیں کرسکتی۔ 30راکتوبر 1947ء کو آپ نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''کوئی قوم ابتلا اور ایثار کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتی۔ ہم شدید دشواریوں اور ناگفتہ بہ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم خوف اور اذیت کے تاریک ایام سے گزرے ہیں لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتحاد، حوصلے، خود اعتمادی اور اللہ کی تائید سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔''

قائداعظم محمد علی جناح ہر مشکل مرحلے پر اپنی قوم کا حوصلہ بڑھاتے رہے، اس کے اندر عزم اور یکجہتی کی روح پھونکتے رہے کیونکہ آپ کا ایمان تھا کہ ہم جس قدر عظیم قربانیاں دیں گے اسی قدر بہتر عمل اور کردار کا مظاہرہ کریں گے۔ 24 ر اکتوبر 1947ء کو آپ نے اپنے ایک پیغام میں فرمایا:

''آپ سب کے لیے میرا پیغام اُمید، حوصلے اور اعتماد کا پیغام ہے۔ آیئے ہم باقاعدہ اور منظم طریقے سے اپنے تمام وسائل مجتمع کریں اور درپیش سنگین مسائل کا ایسے عزم اور نظم وضبط سے مقابلہ کریں جو ایک عظیم قوم کا وتیرہ ہوتا ہے۔''

30 ر اکتوبر 1947ء کو ہی ریڈیو پاکستان لاہور سے قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

''ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہے کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ کام، کام اور کام کریں۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اپنا نصب العین یعنی اتحاد، ایمان اور تنظیم کبھی فراموش نہ کیجیے۔''

8 ر نومبر 1947ء کو قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ باوجود ان خطرات کے جو ہمیں درپیش ہیں، آپ سب مل کر اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے۔''

بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد، آپ کا عزمِ صمیم، آپ کی دردمندی اور آپ کے تدبر و حکمت کے پیشِ نظر اکثر سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے یہ بات کہی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح بیسویں صدی کی ملتِ اسلامیہ اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام تھے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کی تقدیر بدلنا ہو اور

اسے دیگر اقوام کے مقابلے میں سربلندی و سرفرازی کے مقام پر پہنچانا ہو تو وہ اس قوم میں اسے باکمال اور بلند مرتبت انسان پیدا کرتا ہے جو اپنی جرأت و ہمت، تدبر و خلوص اور اصابت رائے سے اس کی تقدیر بدل دیتے ہیں اور وہ قوم زندہ اقوام میں ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے جس پر دنیا رشک کرتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی ایک ایسے ہی انسان تھے جنہوں نے مایوسی اور ناامیدی کی فضا میں عزم و حوصلے کا چراغ جلایا اور اپنی لیاقت و ہمت، معاملہ فہمی، استقامت اور استقلال سے ایک ایسی مملکت وجود میں لانے کا عظیم کام سرانجام دیا جو آج بھی بین الاقوامی امور میں اپنا ایک اہم وجود رکھتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نزدیک پاکستان کا قیام ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کی سمت میں ایک اوّلین قدم تھا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد پورے عالمِ اسلام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر 14 راگست 1948ء کو قوم کے نام اپنے پیغام میں فرمایا:

> ''یاد رکھیے کہ قیامِ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخِ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تاریخِ عالم کی عظیم ترین مسلم مملکتوں میں اس کا شمار ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کو اپنا شاندار کردار ادا کرنا ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ ہم دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرتے رہیں۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر خود کو اسلامی تاریخ، عظمت اور روایات کا امین ثابت کرے گی۔''

آج قیامِ پاکستان کو 70 سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران ہم نے قائداعظم کی ہدایت اور خواہش کے مطابق قومی اور بین الاقوامی امور میں کیا وہی کردار ادا کیا ہے جس کی قائداعظم ہم سے توقع رکھتے تھے؟ اس سوال پر ہم کو بحیثیت قوم ضرور غور کرنا چاہیے۔ پاکستان زندہ باد......

◆◆◆

# قائداعظم کا تصورِ سیاست

مضمون: سکندر حیات

مترجم: ابوالفرح ہمایوں

''جناح کی زندگی کے بارے میں کئی جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔اس کے علاوہ ہر سال کے سال اخبارات اور رسائل مضامین شائع کر رہے ہیں۔مضمون نگار کی نظر سے اب تک ایسی کوئی کتاب یا مضمون نہیں گزرا جس میں متاثر کن انداز میں قائل کیا گیا ہو کہ جناح کی سیاسی حکمتِ عملی نے مسلم لیگ کی تحریک میں جان ڈال تھی اور اسی وجہ سے وہ پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔''

خالد بن سعید نے دو عشرہ قبل یہ بات لکھی۔مگر اس عرصے میں واقعی ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئی جو قائداعظم محمد علی جناح اور پاکستان، دونوں کے بارے میں کسی خاص دلچسپی کا باعث نظر آتی ہو۔ سعید کی اپنی آئندہ آنے والے دو سالوں۔

کی تگ ودو میں اور چند مزید دیگر حضرات، جیسے کہ سلیم ایم ایم قریشی، زیڈ۔ایچ۔زیدی، عبدالحمید، وحید الزماں، شریف المجاہد، آر جے مور، اسٹینلے وولپرٹ اور مرحومہ عائشہ جلال۔

کی بھی رائے یہی ہے کہ اس مسئلے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ بے شمار سوالات کے جوابات اب بھی باقی ہیں۔لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں، مثال کے طور پر، قائداعظم جناح مسلم عوام میں زندگی دوڑانے میں کس طرح کامیاب ہوئے اور ان کی قیادت کیسے کرتے رہے جب کہ ان کے بارے میں کئی افواہیں پھیلائی گئیں اور تنقیدی جملے بھی ہوئے۔''ایسا تصور بھی بعید از قیاس ہے کہ ہندوستان کے مسلم عوام اس کو قبول کرلیں گے۔''

یہ کیسے ممکن ہوا کہ مسلم لیگ تنظیم کے پورے دور میں مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت اسے

حاصل رہی، بلکہ ان صوبوں میں بھی جہاں لیگ صوبے کے طاقتور لیڈروں کے درمیان ایک معمولی حیثیت رکھتی تھی؟ جناح، لیگ کی ماہیت قلب کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے اور مسلمانوں کو ایک منظم تحریک میں جکڑ دیا۔ بے شک یہ انہی کا جنون اور ولولہ تھا یا پارٹی کی سیاسی نمائندگی کا کمال؟ جناح نے اپنی سیاسی صلاحیتوں کا لوہا، صنعت کاروں، تاجروں، مزدوروں اور کسانوں سے کیسے منوایا اور نوجوانوں کے دل میں کیسے گھر کرلیا؟ ذیل کے صفحات میں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جناح کی تیز رفتاری اور حکمت عملی کا ایک مکمل جائزہ پیش کیا جارہا ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان کے مقصد پر جان دینے کو کیوں تیار ہوگئے۔ جناح مسلمانوں کی نقل وحرکت تیز کرنے کا سلسلہ 1935ء میں ہندوستان واپس آتے ہی شروع کردیا۔ (اب تک وہ خودساختہ جلاوطنی کی زندگی لندن میں گزارر ہے تھے)۔ انہوں نے مسلمانوں کو آواز دی کہ ''ایک بڑے خطرے'' سے نبردآزما ہونے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ ان کی آواز یا للکار نے سیاسی افق پر ایک گہرا تاثر چھوڑا۔ خصوصاً لکھنؤ اجلاس 1937ء کے بعد سے۔ مگر لاہور قرارداد 1940ء کے بعد میں تو اس میں کافی تیزی آ گئی اور مقصد کی جانب قدم تیزی سے بڑھنے لگے۔ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ درحقیقت ان کا منصوبہ عظیم تھا۔ جس کے پیچھے ایک پراثر حکمت عملی، اتحاد اور مشترکہ منزل کی لگن شامل تھی کہ پاکستان حاصل کرکے رہیں گے، یہ سب جذبہ صدق دلی کے ساتھ ان کے دلوں میں موجود تھا۔

مصنف کی نظر میں جناح نے چار نکات پر اپنی حکمت عملی کو خوب اچھی طرح ترتیب دیا۔ پہلی منزل میں ان کا نشانہ مسلم لیگ کو اس طرح تیار کرنا تھا کہ داخلے کے نئے نئے راستے کہاں کہاں موجود ہیں، خاص طور پر ان لوگوں کو قریب لانا تھا جو پاکستان سے فکری اور باطنی نسبت رکھتے تھے، چنانچہ وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ترقی پذیر معاشرے میں دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح لیگ بھی ایک منتشر، کمزور اور دقیانوسی، جاگیرداری نظام میں جکڑی ہوئی ایک جماعت تھی۔

ان کے پاس بھی عوام کو متوجہ کرنے اور نئے لوگوں کو شامل کرنے کا کوئی خاص جادو نہیں تھا۔ تنظیم کو وسعت دینے اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ

لیگ کے تمام اختیارات اورقوت کوایک جگہ یعنی صدر کے ہاتھ میں جمع کر دیا۔

گویا کہ لیگ ہی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔

یہ امر اس لحاظ سے بھی ضروری تھا کہ ایک ایسا بااختیار نمائندہ سامنے رہے جو پارٹی کے مفادات کا اظہار کھل کر کر سکے۔ اس عمل کو مزید تقویت دینے کے لیے اور دیگر گروپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جناح نے ایک عوامی رابطے کی مہم شروع کردی اور لوگوں کو ایک ''مقصد'' سمجھایا تا کہ ان کی شناخت ہو سکے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی خوش اخلاقی اور طرزِ عمل سے دوسروں پر ثابت کریں کہ جب ان کی حکومت بنے گی تو مستقبل کس قدر خوش حال ہوگا۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے تمام مواقع حاصل کر کے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیے اور سب کچھ انتہائی خوش اسلوبی سے کرتے رہے کہ دوسرے لوگ بھی ناراض نہ ہوں۔ یہ تمام کارروائیاں خاموشی سے آگے بڑھتی رہیں اور ان کے بے شمار فوائد حاصل ہوئے۔

جناح نے لیگ کی توسیع کا کام نئی انتظامیہ کو اور زیادہ مضبوط بنا کر شروع کیا۔ 1940ء کے آئین کے مطابق۔

15۔ عوامی سطح پر پرائمری لیگ قائم کی گئی جو کہ اپنے اپنے وارڈ، محلہ اور شہر کی نمائندگی کرتی تھی۔ پرائمری لیگوں کے نمائندے، ضلع، تحصیل، اور صوبوں میں مقرر کیے گئے اور ان پر یہ ذمہ داری عائد کردی گئی کہ وہ لیگ کے معاملات کی نگرانی کریں۔ بہت سے ضلعی لیگ کے نمائندوں کو اکٹھا کر کے صوبائی مسلم لیگ مرتب کی گئی جو کہ کسی خاص صوبے کی نمائندگی کرتی تھی۔ صوبائی مسلم لیگوں کو مرکز میں لیگ ورکنگ کمیٹی میں نمائندگی دی گئی۔ دوسری طرف ورکنگ کمیٹی کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے کنٹرول میں دے دیا گیا اور آئین میں طے کیا گیا کہ وہ تمام قراردادیں جو ورکنگ کمیٹی پاس کرے گی، وہ کونسل کی تصدیق اور اجازت سے مشروط ہوں گی۔ کونسل اپنے ممبران میں سے صوبائی لیگوں کو منتخب کرے گی۔ لیگ کے صدر کا انتخاب کونسل کرے گی جو کہ مختلف مسلم لیگ کے نامزد کردہ ممبران کی رائے سے ہوگا۔

لیگ کے نئے تنظیمی ڈھانچے اور نئے نئے راستے تلاش کر لینے کے بعد کئی انفرادی معروف ہستیاں اور گروپ اس میں دلچسپی لینے لگیں۔ زیادہ پر جوش خیر مقدم انداز تعلیم یافتہ، شہری، اوسط طبقے کے لوگوں کی طرف سے آیا۔ ان میں تاجر، صنعت کار، وداگر، بینک والے اور دیگر شعبوں

کے ماہرین شامل تھے۔ نئی نئی سرگرم تنظیموں نے بھی ادھر کا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا جن کو اپنی ترقی کے لیے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے نظریے نے بھی بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ انہوں نے جلد ہی اندازہ کرلیا کہ کانگریس کا نام نہاد "ہندوستانی قومیت" کا نظریہ ناکام رہے گا اور یہ "ہندو قومیت" کی ایک شکل ہے، چنانچہ ہندوؤں کے ساتھ چلنے میں سراسر خسارہ ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ تجارتی اور اقتصادی زندگی پر ہندوستان میں ہندو چھائے ہوئے ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، ماہرین اور حکومت کے عہدے، سب کچھ ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔ ان کو جلد ہی یہ حقیقت سمجھ میں آ گئی کہ اگر وہ اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں تو لیگ میں شامل ہو جائیں اور پاکستان کے لیے کام کریں جہاں ان کو زندگی کے تمام مواقع میسر اور فراہم ہوں گے۔ لیگ کو ایسے تمام لوگوں کی حمایت کی وجہ سے کسی مشکل یا انتشار کا سامنا کرنے کے بجائے، ایک قوت مل گئی جس کی جناح کو سخت ضرورت تھی تاکہ روایتی چپقلش اور گروپ بندی پر نظر رکھی جا سکے۔

16۔ اور نئے پرانے دونوں ساتھیوں کو متحد رکھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مخالف جنس کے گروپ، جیسے کہ تعلیم یافتہ، شہری متوسط طبقے کے لوگ اور زمین دار جو کہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ چند وہ گروپ بھی جو دوسرے گروپ کو مسلم لیگ میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ سب کے سب ایک ہو گئے اور مل جل کر کام کرنے لگے۔ مثال کے طور پر چند علماء لیگ کے ساتھ ملنے کے لیے آگے آئے اور دعویٰ کیا "کہ جو کچھ بھی جاگیرداروں، نوابوں اور دوسرے خطاب یافتہ افراد سے منسوب کردہ باتیں ہیں" جو کہ لیگ میں شامل ہو گئے ہیں، وہ سب غلط ہیں اور ان لوگوں کی ایمان داری اور راست بازی پر اب کوئی شک وشبہ نہیں کیوں کہ وہ جناح کے سائے میں آ گئے ہیں۔

17۔ اگر انصاف کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو "جاگیردار، زمین دار، نوابین اور دوسرے خطاب یافتہ لوگ" جو لیگ میں شامل ہوئے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ لیگ کے مفاد میں کام کیا بلکہ ثابت قدمی سے اپنے رہنما کے ساتھ کھڑے رہے۔ ان میں چند نام یہ ہیں۔ نواب اسمٰعیل خاں، چودھری خلیق الزماں، راجہ صاحب محمود آباد، ایوب کھوڑو، سردار اورنگ زیب خاں اور نواب ممدوٹ۔ یہ وہ چند نام ہیں جنہوں نے پوری لگن اور دل جمعی کے ساتھ جناح کی حمایت کی اور

پاکستان کے نظریے پر کام کیا۔اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔آیئے!ذرا نواب ممدوٹ کی معجزاتی قلب ماہیت پر نظر ڈالتے ہیں۔وہ پنجاب کے ایک بہت بڑے زمین دار تھے۔1946ء میں ایک تقریر کے دوران انہوں نے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔

''جب پنجاب کے مسلمان خواب خرگوش سے جاگنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو خواب آور گولیاں کھلا کر دوبارہ سلا دیا جاتا ہے۔اس دفعہ سر برٹرانڈ گلانسی (Sir Bertrand Glancy) نے زمین کے کئی مربع اور جاگیریں دے کر پھر نیند میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے۔بعض اوقات تو وہ بیس بیس مربع کی خوراک چند مسلمانوں کو دے دیتے ہیں،مگر پھر بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

18۔جناح صاحب بھی اس کی افادیت سے واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ ایک سیاسی رشوت ہے۔لہٰذا انہوں نے صاف طور پر حکم دے دیا کہ وہ اپنا شرعی اور جائز کردار ادا کرتے رہیں اور لیگ اور پاکستان کے نظریے کے مطابق آگے بڑھتے رہیں،چنانچہ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے زمین دار اس حکم کے مطابق عمل کرتے رہے اور ذرا بھی لالچ میں نہ آئے۔

19۔ان کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ لیگ نے ان کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچایا جیسا کہ ان کا حق تھا۔

20۔''ہمارا ابھی وقت آئے گا۔انہوں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔'' ہمارے درمیان بھی لڑائی جھگڑے شروع ہو جائیں گے،لیکن ہم رفتہ رفتہ ان اختلافات پر قابو پالیں گے۔ہمارے زخم اور دکھ درد کا تدارک ہو جائے گا۔ہمارے پاس اتنا وقت ہوگا کہ ہم گھریلو پروگرام اور حکمت عملی کے لیے وقت نکال لیں گے،مگر پہلے ہماری حکومت تو آنے دیجیے۔ابھی یہ قوم کسی سلطنت کے بغیر ہے۔

21۔نئے لوگوں میں جوش پیدا ہو جانے کے بعد اور لیگ کے سیاسی دوست کے مل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ ''رجعت پسند'' اور ''قدامت پرست'' جماعت نہ رہی،اور نہ جاگیرداروں کا اثر باقی رہا۔نواب اور خطاب یافتہ شرفا اور روایتی سماجی حلقے جو ماضی میں دعویٰ کرتے تھے اور فضول تنقید کرتے تھے اور ان سے پہلے کے لوگوں کی بھی زبانیں بند ہو گئیں۔

22۔اب اس کے نمائندے مہذب،تعلیم یافتہ،شہری اوسط خاندان کے لوگ،تاجر،صنعت

کار، سوداگر، بینکر اور بیوپاری، مسلم معاشرے کے روشن خیال لوگ تھے۔

23۔ ہندوستانی مسلم قوم پرست جماعت اب بالکل تبدیل ہو کر معاشرے کے تمام لوگوں کو ساتھ لے کر چل رہی تھی۔ روایتی اور جدید، ایک نئی زندگی میں ڈھل گئے تھے اور ان کے ذہن میں یہ شعور جاگ اٹھا تھا کہ وہ ایک الگ لوگ ہیں، جن کے اندر ایک امنگ، طاقت اور پروگرام کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے، جو کہ ان کا اپنا ہے۔

24۔ مگر باہر سے آنے والے اپنے ساتھ لڑائی، دنگا اور فساد بھی لے آئے، اور جہاں ابھی تک حسن ترتیب اور ہم آہنگی تھی۔

25۔ اب مسلمانوں کے درمیان نوک جھونک ہونے لگی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آگے چل کر یہ خانہ جنگی بے قابو ہو جائے گی۔ اس طرح اس خاص نظریے کو نقصان پہنچ سکتا تھا جس کے لیے ان گروپ کو اگلی صف میں جگہ دی گئی تھی۔ اب صورت یہ تھی کہ کسی معجزے کا انتظار تھا جو مفادات کو جوڑ دے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کا مطالبہ ایک مشترکہ مقصد تھا اور ان سب کے لیے ایک ہی جیسی اہمیت رکھتا تھا، مگر ہر گروپ پاکستان کے مطالبے کو۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا، جہاں ان کو اپنا مفاد نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسی مسحور کن موسیقی کی شدید ضرورت تھی جو لیگ کے اندر پھیلی ہوئی بے چینی کو ایک دائرے میں لے آئے۔ لیگ کے صدر جو پارٹی کے سربراہ بھی تھے، اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ کار آمد شخص تھے، چنانچہ انہوں نے فی الفور سختی شروع کر دی اور تنظیم اور اتحاد پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔ لیگ کے قوانین متواتر 1941ء، 1942ء اور 1944ء میں نافذ ہوئے جس کے ذریعہ صدر کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1944ء کے آئین میں یہ قول و قرار طے ہوا کہ صدر پوری تنظیم کے سربراہ ہوں گے اور اس بات کی نگہداشت کریں گے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے تمام قوانین پر عمل ہو رہا ہے اور سب لوگ اپنے فرائض ایمان داری اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

26۔ صدر کے دفتر کے اختیارات بڑھانے کے لیے جناح صاحب کو مزید صدارتی اختیارات دے دیے گئے تا کہ ان کی اخلاقی حمایت میں اضافہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ اقتدار کو مکمل اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے تا کہ مختلف گروہوں کے مفاد میں کام کریں۔ اس طرح لیگ ایک ایسی مسلم تنظیم بن گئی جس کے مختلف موتی ایک ہی لڑی میں خوبصورتی سے پرو دیے گئے تھے۔

مگر یہ کوئی آسان منزل نہیں تھی۔ انہیں حمایت نہیں مل رہی تھی اور ان گروہوں کو سنبھالنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی جنہوں نے لیگ میں شمولیت اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر کی تھیں، جیسا کہ سندھ کے معاملے میں دیکھا گیا۔

27۔ ان کو ایسے لوگوں نے بھی پریشان کر کے رکھ دیا جو لیگ میں شاطرانہ مقاصد لے کر آئے تھے اور یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔ پنجاب اور بنگال کے وہ صوبائی قائدین جنہوں نے لیگ میں شمولیت لکھنو 1937ء میں تھی، وہ بھی بڑی پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ وہ مرکز کا اقتدار تسلیم کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان وجوہات کے ذمہ دار سکندر حیات خاں، پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور مولوی اے کے فضل الحق بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اور تب جناح صاحب کے سامنے واضح ہو گیا کہ براہ راست اور ٹھوس قوت حاصل کیے بغیر ان صوبائی ضدی لیڈروں کو قابو کرنا مشکل ہے، لیکن ان کو دوست بنائے بغیر لیگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کی بااختیار اور واحد نمائندہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا کہ ان آزاد خیال صوبائی قائدین کو مرکزی لیگ کے دھارے میں کیسے شامل کیا جائے، اگرچہ یہ ایک طویل اور دشوار سفر ہوگا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ سکندر حیات خاں، مسلم لیگ کی طرف راغب نہیں ہیں، جناح صاحب نے ان کے دل میں محبت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ نہ صرف یہ کہ انہیں لیگ ورکنگ کمیٹی کا رکن منتخب کر لیا گیا بلکہ ان کو یہ اجازت بھی دے دی گئی کہ ان کے یونینسٹ پارٹی کے ساتھی بھی لیگ کونسل میں ایک نمائندہ واثر ورسوخ رکھ سکتے ہیں، اگرچہ پرانے مسلم لیگی جیسے کہ علامہ اقبال کو یہ ناگوار محسوس ہوا۔ معاملہ عروج پر اس وقت پہنچا جب لیگ کونسل نے 3/ اپریل 1938ء کی میٹنگ میں پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کا الحاق مسترد کر دیا، جس کی نمائندگی پرانے لیگی کر رہے تھے۔ بے شک جناح کے دل میں ان کی عزت اور وقعت تھی اور وہ جانتے تھے کہ لیگ کے چاہنے والے بے حد حساس ہیں۔ مگر صوبے میں طاقت کا ترازو کس طرف جھک رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے پورا سال پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو راضی کرنے میں لگا دیا۔ وہ سکندر حیات خاں کو سمجھاتے رہے کہ پنجاب میں وہ لیگ کے ساتھ بھی کچھ ہمدردی رکھیں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ لیگ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو جائے۔ یہ بھی جناح کی ''توسیعی'' پالیسی کا

ایک حصہ تھا جس سے صوبائی رہنما بھی متفق تھے۔ وہ اپنے اختیارات میں مزید توسیع چاہتے تھے لیکن انہیں اس بات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی کہ ان کا اقتدار بھی مضبوط ہو۔ مگر جیسے جیسے لیگ عوام میں مقبول ہوتی گئی اور پنجاب کے لوگوں میں پاکستان کے مطالبے کا شعور بیدار ہوتا گیا بلکہ دیگر صوبوں میں بھی یہ احساس اجاگر ہونے لگا تو وہ اگلا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گے۔

28۔ 1941ء میں انہوں نے سکندر حیات خاں پر دباؤ ڈالا کہ وہ وائسرائے کی نیشنل ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں، جس کو انہوں نے لیگ کے صدر کی پیشگی اجازت اور منظوری کے بغیر تسلیم کر لیا تھا۔ پنجاب میں لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1942ء آتے آتے سکندر حیات خاں "جناح کی ابھرتی ہوئی طاقت سے بیزار اور ناخوش نظر آنے لگے" بلکہ مزید برہم ہوتے ہوئے انہوں نے "جناح کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔" درحقیقت وہ خوف زدہ ہو گئے تھے، جیسا کہ انہوں نے پنڈریل مون ( Penderal Moon) کو بتایا کہ "وہ جناح کے قریب رہے بلکہ ان کا دایاں بازو بن گئے، مگر انہیں ہر دم یہی ڈر لگا رہتا کہ مذہبی جوش اور جنون کی وجہ سے ان کی قدر نہیں کی جا رہی ہے اور کسی بھی وقت ان کو الگ کر دیا جا سکتا ہے، اور وہ جہاں بھی جائیں گے، مسلمان ان کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کریں گے۔

29۔ ایک بات واضح ہے کہ صوبائی مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں جو لائل پور میں ہوا تھا، اس میں انہوں نے شرکت کی تھی۔ اس اجلاس کی صدارت جناح صاحب کر رہے تھے۔ لیگ کے مطالبے کی حمایت میں انہوں نے تقریر بھی کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سکندر حیات خاں نے لیگ میٹنگ میں پنجاب میں کوئی خطاب کیا تھا۔ جناح صاحب کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے، ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی، جو کہ جناح کے قریبی ساتھی اور لیگ کے اہم رہنما تھے، نے اس سارے قصے کو مختصراً یوں بیان کیا ہے۔ قائد نے سر سکندر کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔ جو تحمل اور استقلال انہوں نے دکھایا، وہ حیرت انگیز تھا۔ پنجاب کے مسلمان بڑی تیزی سے مسلم لیگ کی جانب راغب ہو گئے اور اختلافات کے باوجود (سکندر حیات کی جانب سے) مسلم لیگ صوبے میں طاقت حاصل کرتی چلی گئی۔"

نومبر 1942ء آتے آتے، پنجاب مسلم لیگ اس مقام پر پہنچ گئی کہ اب لائل پور میں ایک صوبائی کانفرنس منعقد کر سکتی تھی۔ یہ کانفرنس اٹھارہ نومبر کو ہوئی۔ اس میں قائداعظم شریک، ہوئے

اور خطاب بھی کیا۔ سر سکندر حیات خاں نے جب عوام کا رویہ دیکھا تو وہ بھی کانفرنس میں نمودار ہو گئے اور ایک تقریر بھی کی۔ اس سے قبل وہ صوبے میں لیگ کی میٹنگوں میں حاضری دینے سے کتراتے رہے تھے۔

30۔ جناح صاحب نے خود اپنے آغاز کلام میں (بحوالہ اقبال کا خط جناح کے نام 1942ء) سکندر حیات خاں کے طرز عمل کی نہ صرف طرف داری کی بلکہ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کے نتائج بہت معنی خیز برآمد ہوئے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے، انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''اقبال یہ دیکھنے کے لیے موجود نہ رہے کہ پنجاب میں نہایت شاندار ترقی ہوئی ہے اور اب یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہاں کے مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مسلم لیگ کی تنظیم کے ساتھ کھڑے ہیں۔''

31۔ سکندر حیات کے معاملے میں جناح صاحب نے نہ صرف دور اندیشی کا ثبوت دیا بلکہ انہوں نے اس طرح یہ موقع بھی تلاش کر لیا کہ اسی طرح فضل الحق کو بھی لیگ میں شامل کر لیا جائے، خواہ وہ نیم دلی سے ہی کیوں نہ آئیں، ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ فضل الحق، سکندر حیات کی طرح اپنی صوبائی قیادت کی قربانی نہیں دینا چاہتے تھے، اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ صوبے کی لیگ اتحاد وزارت کے سربراہ تھے۔ جب لیگ کے قائدین نے اصفہانی اور فضل الحق پر تنقید کی کہ ''لیگ سے آپ کی وفاداری برائے نام ہے۔''

32۔ تو جناح نے ان کو صبر کی تلقین کی اور سکندر حیات خاں کا حوالہ دیا۔ وہ لیگ کی مقبولیت کی خاطر زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ فضل الحق کے تعاون سے بہت فائدے حاصل ہو سکتے تھے، خواہ لیگ سے کچی ڈور سے ہی کیوں نہ بندھے رہیں۔ انہوں نے اصفہانی کے سامنے وضاحت کرتے ہوئے کہا (خط کے ذریعہ) آپ ہر ایک سے یہ امید نہیں رکھ سکتے ہیں کہ فوراً ہی ہر خواہش آپ کی مرضی کے مطابق پوری ہو جائے گی۔ ابھی آغاز ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ آپ مقاصد اور منافع کو ایک نظر سے نہ دیکھیں۔ منزل کا حصول فوری طور پر ممکن نہیں اور اس کے لیے محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ بنگال میں کام تیزی سے ہو رہا ہے اور ہمیں عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ معاملات ہماری مرضی کے مطابق آگے بڑھ رہے ہیں، بس ذرا ہمت اور حوصلے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

33۔ بعد میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات نے ثابت کیا کہ جناح کا طریق کار انتہائی مفید تھا۔ نہ صرف یہ کہ جلد ہی لیگ صوبے کی ایک مقبول جماعت بن گئی، فضل الحق بھی اپنی اوقات میں آ گئے۔ وہ مجبور ہو گئے کہ سینٹرل لیگ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لیں۔ 1941ء میں جب وہ قلا بازی کھانے کا ارادہ کر رہے تھے اور احتجاج کر کے آداب و رسوم کی خلاف ورزی کر رہے تھے، تب لیگ کی طرف سے ان کے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا گیا اور اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ اس مسئلے پر آپ کو لیگ سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ تیرہ نومبر 1942ء میں وہ جناح صاحب کو یقین دلا رہے تھے۔ ''آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ سے ملنے کے لیے میں کس قدر بے چین تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میرا آپ سے اور لیگ سے تعلق برقرار رہے۔''

34۔ پانچ فروری 1943ء کو وہ اپنی پارٹی ''تحلیل'' کرنے پر آمادہ ہو گئے اور وزارت اعلیٰ سے بھی استعفیٰ دینے کو تیار ہو گئے اگر لیگ ان کو اپنے اندر شامل کرنے کو تیار ہو جائے۔

35۔ یقیناً یہ منظر ابھر کر ان کے سامنے آ گیا ہو گا کہ لیگ بڑی تیزی سے اپنے اثرات بڑھاتی جا رہی ہے۔ لیگ کے امیدواروں نے بڑی بھاری اکثریت سے ''ناٹور'' حاصل کر لی تھی اور جس کا اتحاد فضل الحق وزارت سے تھا۔ 1943ء میں یہ حال ہو گیا کہ فضل الحق وزارت اکثریت سے محروم ہو گئی اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جناح صاحب کے پاس جائیں اور انہیں یقین دلائیں کہ ''میں پارٹی کے اصول اور قوانین کی پابندی کروں گا اور مسلم لیگ کے صدر کے احکامات کو تسلیم کروں گا۔''

36۔ ستمبر 1946ء میں وہ لیگ میں واپس آ گئے، شرمسار اور دھیمے ہو کر معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ لیگ کے آنے والے نئے آئین کے مطابق جناح نے انہیں موقع دیا، جس میں کہا گیا تھا کہ صوبائی قائدین کو مرکز کے مکمل قابو میں رکھا جائے، چنانچہ کسی سکندر حیات اور کسی فضل الحق کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ قائداعظم کے احکام سے سرتابی کر سکیں۔''

37۔ سکندر حیات خاں 1942ء میں وفات پا گئے اور پنجاب میں جناح کے مستقبل کے منصوبوں کو تاریک کر گئے۔ ان کے جانشیں ایم۔ خضر حیات خاں جن کی پشت پناہی برطانوی حکومت کر رہی تھی، جناح کے اقتدار کے سامنے خم ٹھونک کر آ گئے، نہ صرف مرکز میں بلکہ صوبے میں بھی لیگ سے تعلق توڑ لیا۔ بلکہ اب تو چھوٹے موٹے حقیر برطانوی حکومت کے ملازمین سے

لے کر پنجاب کے گورنر، گلینسی (Glancy) اور ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ واول (Lord Wavell) تک نے جناح صاحب کو ستانے اور پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔

38۔ لارڈ واول تو یہ سن کر سخت حیران رہ گئے کہ پنجاب کا ایک طاقتور جاگیردار ایک معمولی سے وکیل کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا۔

39۔ مگر اب پنجاب میں یہ کوئی نرالی بات نہیں تھی کیونکہ یہاں برطانیہ چھایا ہوا تھا۔ برطانیہ کی حکمت عملی یہ تھی کہ جناح کو مسلم اکثریت کے علاقوں سے دور رکھا جائے۔ یہاں تک کہ یوپی، جہاں مسلمانوں کی اقلیت تھی، اس کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ 1937ء کے آغاز میں ایک برطانوی عہدے دار جو یوپی کے گورنر کا سیکریٹری تھا، پوچھتا پھر رہا تھا۔ ''یہ جناح کون ہے جو یوپی کے مسلمانوں سے رابطہ رکھنا چاہتا ہے، اس کا یوپی سے کیا تعلق ہے؟''

40۔ جناح صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ خضر حیات خاں لیگ کے ساتھ تعلق قائم رکھیں، لیکن محض ایک حلیف کے طور پر نہیں، جیسے کہ انہوں نے سکندر حیات خاں کو اوّلین عہد میں قبول کر لیا تھا لیگ کی غیر معمولی اٹھان، جو پنجاب میں حالیہ برسوں کے دوران ہوئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے پارٹی میں مزید نظم وضبط پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اس لیے جناح، خضر حیات کو ایک پیروکار اور شاگرد بنانے پر تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے خضر حیات خاں سے مطالبہ کیا کہ مرکزی لیگ کے اصولوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں۔ وہ بذات خود اپریل 1944ء میں لاہور آئے تا کہ خضر حیات سے تفصیلی بات چیت کریں۔

41۔ مگر خضر حیات خاں، جن کو برطانوی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی، اور دوسری طرف یونینسٹ پارٹی کے دیگر ارکان ان کو بھڑکا رہے تھے جس میں سر چھوٹو رام خصوصاً قابل ذکر ہیں، خضر حیات نے حاضر دینے سے انکار کر دیا۔ تقدیر کی گردش دیکھیے کہ خضر حیات خاں کے زوال کا آغاز ان کی اسی حرکت سے ہوا۔ جناح صاحب نے، نہ صرف یہ کہ مرکز میں شملہ کانفرنس 1945ء کے دوران۔

42۔ ان کے سیاسی سفر کو آگے بڑھنے سے روک دیا بلکہ ان کی حیثیت کو ان کے اپنے صوبے میں بھی للکار دیا۔ پنجاب میں عوام کی حمایت میں تیزی آتی جا رہی تھی اور پاکستان کا شعور مزید بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کو 46-1945ء میں انتخابات

میں پریشان کر دیا اور جنوری 1947ء میں پرزور عوامی احتجاج کے ذریعہ ان کو مجبور کر دیا کہ وہ وزارت سے استعفیٰ دے کر اقتدار لیگ کے حوالے کر دیں۔ تین مارچ کو خضر حیات خاں نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کرنے کو تیار ہیں اور وہ یہ قربانی مسلمانوں اور لیگ کے مفاد کے لیے دے رہے ہیں۔

43۔ دلچسپ بات یہ کہ جب جناح مزید اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ مسلم لیگ کو لیگ کے صدر کے قابو میں رکھا جائے تو انہوں نے بعض اختیارات دوسروں کو دینے میں بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ انہوں نے دسمبر 1943ء میں ایک کمیٹی ''Committee of Action'' بنائی جس میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات ارکان شامل ہو سکتے تھے، اور ان سے کہا گیا کہ دائرے میں رہ کر اپنے اختیارات کا استعمال کریں۔ انہوں نے لیگ کے کراچی اجلاس، دسمبر 24/1943ء میں یہ بات بتائی۔

''مسلم لیگ آرگنائزیشن کی ذمہ داریوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ ان کو سنبھالنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں تنہا کیا کیا کام کر رہا ہوں، تو آپ حیرت سے دنگ رہ جائیں گے۔ جگہ جگہ مجھے جانا پڑتا ہے، کبھی پٹنہ، کبھی بنگال، کبھی شمال مغربی سرحدی صوبہ اور کبھی مدارس، ہزاروں طرح کے سوالات کے جوابات دینے پڑتے ہیں۔ اتنے سارے کام اگر ایک آدمی کے کاندھے پر ڈال دیے جائیں تو وہ ان سے انصاف نہیں کر سکے گا۔''

44۔ ان حقائق سے اظہار ہوتا ہے کہ جناح کس قدر دیانت دار اور جدید خیالات کے حامی تھی۔ جناح پہلے ہی ہننگٹن (Huntington) کی تعلیمات کا مطالعہ کر چکے تھے جس کی لازمی شرائط کچھ اس طرح تھیں۔ ایک مقبول و معروف آمر، ایک کرشمہ ساز لیڈر یا ایک قومی فوج کا جوان بیک وقت اقتدار اور اختیارات کو خوش اسلوبی سے انجام دے کر کمال کر سکتا ہے۔

45۔ اختیارات کی تقسیم کا یہی مناسب وقت تھا۔ مگر یہاں بھی جناح نے مناسب اور اخلاقی راستہ اپنایا اور جدید انداز پر عمل کیا۔ اختیارات کو لیگ کے اندر اور باہر، دونوں طرف تقسیم کرنا تھا۔ یہ ایک ''ایک پارٹی نظام'' تھا۔ 46۔ جناح صاحب نے مختلف مواقع پر ان باتوں کی وضاحت کر دی۔ ہمارے درمیان کوئی ''شو بوائے'' نہیں ہونا چاہیے، جیسے کہ کانگریس میں مولانا

ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ بات انہوں نے جولائی 1945ء میں کہی۔ نہ ہی کوئی ایسا مسلمان ہو جو ''غیروں کی چاپلوسی'' کرتا ہو جیسے کہ خضر حیات خاں۔ یہ بات انہوں نے 1945ء کو سرحد کے مسلمانوں کو ایک پیغام میں انہوں نے کہا۔'' مسلم لیگ کے امیدوار کی حمایت کریں۔ خواہ وہ روشنی کا کھمبا ہی کیوں نہ ہو۔

48۔ انہیں اس بات کا پوری طرح احساس اور یقین تھا کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اگر کسی کو لیگ کی حکمت عملی سے اختلاف ہے تو وہ آ کر مجھے قائل کرے کہ لیگ کی پالیسی مسلمانوں خ ے لیے ضرر رساں ہے۔

49۔ دراصل جناح نے لیگ کو پاکستان کے مطالبے کے نظریے سے خود ہی تقسیم کر دیا تھا۔ '' بلکہ ہر حال میں مسلم لیگ کے امیدوار کے حق میں آپ کا ووٹ آنا چاہیے۔''1945ء کے انتخابات میں تقریروں کے ایک سلسلے میں انہوں نے کہا۔ اس الیکشن کا مطلب ہے پاکستان۔ مسلم لیگ کے خلاف ایک ایک ووٹ جو جائے گا، وہ ہندو راج کے حق میں ہو گا۔

50۔ لیگ پاکستان ہے اور پاکستان، لیگ۔ دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہ جناح کی طرف سے ایک تصدیق کی مہر تھی اور ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل تھی کہ لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور آئندہ کی تیاری کریں۔

جناح کی اپیل دو مرحلوں پر مشتمل تھی'' سادہ'' اور'' با قاعدہ'' سادہ اپیل کے دو نمایاں اور اہم حصے تھے۔ پہلا اہم نکتہ مسلمانوں کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے تھا اور ایک ٹھیک مخالف۔ دونوں کا نشانہ برطانیہ اور ہندو تھے، بس ایک بار برطانیہ کو یہاں سے نکلنے کی دیر تھی۔ برطانوی پارلیمانی سسٹم کی بنیاد اکثریت کی اصول پر قائم تھی اور اس کا استعمال کانگریس کے ہاتھ میں۔ 39-1937ء کے سال یہ واضح کرتے ہیں کہ جو بھی آئینی حفاظتی اقدامات اس نظام کے تحت کیے گئے تھے، اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔'' مسلم انڈیا، ہر حال میں'' جناح نے زور دے کر کہا۔ ایسے کسی قانون کو ہرگز قبول نہیں کرے گا جس کے نتیجے میں ہندو اکثریتی حکومت قابض ہو جائے۔ ہندو اور مسلم کو ایک ضابطہ کے دائرے میں قید کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اکثریت یعنی ہندو راج قائم ہو جائے گا۔

51۔ فوراً ہی بعد جناح صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔'' مسلمان، ایک

اقلیت نہیں ہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان اور ہندو دو الگ اور مختلف قومیں ہیں اور قوم کی تعریف کے نقطہ نظر سے بھی مسلمان ایک قوم ہیں، چنانچہ ان کا ایک الگ وطن ہونا چاہیے۔

52۔انہوں نے لفظ ''مسلمان'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہماری تعداد دس کروڑ ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ بھی ہو۔ ہماری ایک الگ تہذیب و تمدن اور رہن سہن ہے، زبان و ادب، آرٹ اور فن تعمیر، نام اور فرہنگ، اقدار کی سمجھ بوجھ اور اس کا تناسب، عدالتی قوانین اور کردار کا اخلاقی معیار، رسم و رواج اور تقویم، تاریخ اور عقیدہ، وضع، انداز اور چہرہ مہرہ، عزم و استقامت وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ہماری زندگی اندر اور باہر، ہر طرف سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ بین الاقوامی معیار کے ہر مذہبی قانون کے تحت ہم ایک قوم ہیں۔

جناح کی اپیل کا دوسرا عنصر جو کہ بے حد اہم تھا، وہ یہ تھا کہ اسلام ایک سیاسی اور معاشرتی طاقت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائی، روحانی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں ترقی کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارا خیال ہے کہ ہم اپنے تصور اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔ انہوں نے کہا اسلام محض چند رسوم اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور ہر مسلمان کو اسے اپنی زندگی میں سمو لینا چاہیے۔ انہوں نے مزید وضاحت کی۔ یہ ہر وقت اور ہر جگہ گردش میں ہے، مذہبی تقریبات سے لے کر روزمرہ کی زندگی میں، روح کی نجات اور بقا سے لے کر صحت اور زندگی تک، اخلاق، کردار اور جرم سے سزا تک، یہاں بھی اور آنے والی زندگی میں بھی۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو تمام مسلم معاشرے میں گردش کر رہا ہے، زندگی تک، اخلاق، کردار اور جرم سے سزا تک، یہاں بھی اور آنے والی زندگی میں بھی۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو تمام مسلم معاشرے میں گردش کر رہا ہے، زندگی کے ہر شعبے میں، اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی۔

جناح کی گزارش قدیم اور جدید خیالات کی آمیزش کا ایک مثالی نمونہ تھی، جس میں ایک طرف انہوں نے قوم، ریاست، زبان، تہذیب اور تاریخ کے حوالے کے ساتھ ساتھ، صنعت و حرفت کی ترقی، اسلام کی مذہبی اقدار اور دوسری باتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور دوسری طرف معاشرے کے بھیانک اور کمزور پہلوؤں پر بھی توجہ دلائی تھی اور ان کو اس طرف راغب کرنے کی

کوشش کی تھی کہ تمہارے فرائض کیا ہیں، ان کو پہچانو، لیکن قبل اس کے کہ ہم ان کی نشان دہی کریں اور ان کے گھناؤنے کردار کا ذکر کریں، جنہوں نے پاکستان کے پرستاروں اور حامیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی، ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ انہوں نے ایک پرمعنی کردار بھی انجام دیا، وہ یہ کہ جناح کی نقل وحرکت میں اور تیزی آ گئی۔ ان کی گزارش جو روایتی اور جدید انداز کا ایک معیاری نمونہ تھی یا قومی تحریک اور مذہبی شناخت کے جذبات سے بھرپور تھی اور اب ہندوستان میں ایک نادر مثال قائم ہوگئی۔ قوم پرست تحریکوں کے متعدد قائدین نے قوم کا تصور اور مذہبی اقدار کو سیاسی ترقی میں ضم کر دیا تھا، خصوصی طور پر مسلم دنیا میں یہ رویہ عام تھا۔

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ (Wilfred Contewell Smtth) نے مسلم دنیا کی قومی تحریکوں پر ایک طویل جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”قومیت کی قوت تحریک زیادہ سے زیادہ مذہبی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے اور یہ عوام کے دل میں سرایت کر گئی ہے۔ یہاں تک کہ قائدین اور نظم و نسق اور تحریک سے نظریات مغربی تصور میں ڈھل گئے ہیں۔ لیکن مرید، قربت رکھنے والے اور جذبات معنی خیز انداز میں اسلامی ہیں۔ جناح کے بارے میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ شعوری اور محتاط انداز میں عوام کے دلوں میں اسلامی تصور کو اجاگر کرتے جا رہے تھے جس میں پاکستان کا مطالعہ بالکل نمایاں تھا۔ انہوں نے 1943ء میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہ بات سردار شوکت حیات خاں کے گوش گزار بھی کر دی۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال بڑی شان اور طمطراق سے حکومت کی۔ مگر اب کیا صورتِ حال ہے۔ آج دہلی کے گردونواح میں مغل شہزادوں کی اولادیں شدید محنت مشقت کر کے اپنی روزی کمانے پر مجبور ہیں۔ مسلمانوں کی حالت روز بروز روبہ زوال ہوتی جا رہی ہے کیونکہ برطانیہ کے دورِ حکومت میں ہندو، جوڑتوڑ اور سازش کر کے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ذرا غور کیجیے، متحدہ ہندوستان میں جب ہندو کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا تو مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی؟ ان کا درجہ اچھوتوں سے بھی بدتر ہوگا۔ یہ ہے مستقبل کا نقشہ۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لازم ہوگیا ہے کہ مسلمان ان علاقوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں، ایک آزاد ریاست قائم کریں۔ اگر ذرا اور روشن خیالی اور عروج پر نگاہ ڈالیں تو پاکستان کی سرزمین ایک ایسی بنیادی اور پلیٹ فارم بن سکتی ہے جہاں سے ہم مسلم دنیا میں ایک انقلاب برپا کر سکتے ہیں اور اپنی آئندہ نسل

کو اعلیٰ تعلیم دے کر ہر شعبے کے ماہرین پیدا کر سکتے ہیں۔ اسلامی علوم وفنون کا احیا کر کے ہم پاکستان کو اسلام کا گہوارہ اور نمونہ بنا سکتے ہیں۔ یہی نوجوان مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک میں پھیل کر خدمات انجام دیں گے اور ان کے دلوں میں جاگنے اور زندہ رہنے کی امنگ پیدا کریں گے۔ مشرق وسطیٰ کی پوری پٹی بیدار ہو کر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے گی، ایک تیسرا بلاک بن جائے گا جو نہ ہی کمیونسٹ ہوگا اور نہ سرمایہ دار۔

سب سے زیادہ اہم اور نمایاں عنصر جس نے جناح کی گزارش پر لبیک کہا، وہ تین طبقے کے لوگ تھے۔ 1۔ طالب علم ۔2۔ علماء، پیر اور سجادہ نشیں ۔3۔ خواتین ۔ یہ وہ افراد تھے جن کے دلوں پر جناح کی پراثر باتوں نے سب سے زیادہ جوش پیدا کیا چنانچہ یہ لوگ بڑے جوش وخروش کے ساتھ لیگ کے نظریات کو لے کر پھیلاتے چلے گئے اور سب کچھ وہ اپنے زور بازو پر کر رہے تھے جس کو جناح اور لیگ کی حمایت حاصل تھی۔ یہاں ان کی ہمت وشجاعت اور کارکردگی پر زیادہ تفصیل سے بات کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بے شک انہوں نے باہم ایک دوسرے کو تقویت پہنچائی اور سب کچھ خلوص نیت سے کیا۔ بہر حال ان کے حساب کتاب اور کارکردگی کو مختلف عنوانات کے تحت جانچا جا سکتا ہے۔

1۔ طالب علم:

چونکہ ابھی وہ علم کی دولت حاصل کر رہے تھے، لہٰذا وہ ہندوستان میں ترقی کے تمام باتوں اور راستوں سے بخوبی واقف تھے، آئینی اور فرقہ بندی کی مناسبت سے، لہٰذا انہوں نے جناح کی درخواست اور مطالبہ پاکستان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ تمام سرکاری ملازمتوں پر اور دیگر شعبوں میں ماہرین کے طور پر ہندو چھائے ہوئے ہیں، چنانچہ مسلمانوں کو مستقبل انتہائی غیر محفوظ ہے۔ وہ غور کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کی یہاں کوئی قدر نہ ہوگی اور ملازمتیں حاصل کرنے میں انہیں انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، بلکہ اس طرح وہ ہندوستان میں اقلیت بند کر رہیں گے اور ان سے وہی سلوک ہوگا جو کینہ پرور اور منتقم مزاج اکثریت، اقلیت کے ساتھ روا رکھتی ہے۔ یقیناً مسلم طالب علموں کا یہ تجزیہ بالکل درست تھا۔ مسلم معاشرے کا ہر فرد یہ سب کچھ سوچ کر تذبذب کا شکار تھا۔ مگر اس مایوسی اور محرومی نے نوجوان ذہن پر اور برا اثر ڈالا اور وہ مزید ذہنی کرب اور الجھن کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان کو پاکستان

کی صورت میں ایک قدرتی راستہ نظر آ رہا تھا جہاں ان کے کچلے ہوئے جذبات کو ایک مرہم اور تریاق مل سکتا تھا۔ یہ ان کی مثبت سوچ اور ذہانت کی دلیل تھی کہ ان کی سوچ حصول پاکستان پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔

ہندوستانی طلبا ایک عرصے سے سیاسی افق پر متحرک تھے، اس عرصے میں بنگال کی تقسیم (1905--11ء) بھی عمل میں آ گئی۔ جناح نے طلباء کو خاص طور پر مشورہ دیا کہ وہ فی الحال سیاست کو ملتوی کر دیں اور اپنی پوری توجہ پڑھائی اور سیاسی صورتِ حال پر رکھیں۔ یہ مشورہ 1937ء کی مشکل صورتِ حال کو دیکھ کر کر دیا گیا تھا جب ہندوستانی مسلمان ایک دوسرے کے مدِ مقابل آ گئے تھے۔ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا مقصد مسلم طلبا کی تنظیم سیاسی پلیٹ فارم پر کرنا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے خدوخال اُبھرے نہیں تھے اور طلبا کی سیاسی سرگرمیوں کوئی تیزی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ جناح صاحب چاہتے تھے کہ طلبا کو کچھ سوچنے سمجھنے اور اپنی ذمہ داریوں کے احساس کو جگانے کا موقع دیا جائے۔ مگر جناح صاحب اس معاملے کو زیادہ طول بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ طلبا کو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک کردار بھی انجام دینا تھا اور اس سلسلے میں اہم ترین کام یہ تھا کہ عوام کی رفتار پاکستان کی حمایت کے لیے تیز تر کی جائے۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن یو پی کو ایک پیغام 1944ء میں دیتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا۔

"مسلم طالب علم اور نوجوانو! یہ اب تم پر منحصر ہے کہ اس قوم کو سنبھالو اور ان کو اسلامی اقدار کے مطابق بلندیوں پر لے جاؤ۔ رضا کارانہ طور پر آگے بڑھو اور اسلام اور ملت کے ستارے کو روشن کر دو۔ نوجوان آگے بڑھیں اور قوم کے لیے آزادی کی جنگ لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ گراں قدر ذمہ داری آپ اچھی طرح سنبھال سکتے ہیں۔"

یہ "کربناک حقیقت" مسلم طلبا کے ذہن سے ابھی محو نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ اپنے آپ کو منظم کیا اور یہ عزم وارادہ لے کر آگے بڑھے کہ پاکستان کی جدوجہد کسی صورت میں ناکامی کا شکار نہیں ہوگی۔ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں کے دورے کا پروگرام ترتیب دیا۔ خصوصاً موسم گرما کی چھٹیوں میں۔ ان کا ارادہ تھا کہ عوام سے براہ راست رابطہ کریں گے اور استدلال کے ذریعہ انہیں سمجھائیں گے کہ پاکستان کیوں ضروری ہے۔ انہوں نے دورے کے لیے دور دراز دیہاتوں کا انتخاب کیا جہاں زندگی کی سہولتیں محدود تھیں۔ علی گڑھ کے

طالب علم پنجاب اور سندھ کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے اور پاکستان اور لیگ کی حمایت کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ ان بیگانے اور انجان علاقوں میں سفر کے لیے طلبا اپنے ساتھ مختلف رسائل اور کتب اور میگزین وغیرہ ساتھ لائے تھے جن میں پاکستان کے بارے میں مضامین اور تقریر وغیرہ شامل تھیں۔ ان میں ایک رسالہ ''بیداری'' جس کا انگریزی میں نام (Awakening) تھا۔ یہ ہفتہ وار شائع ہوتا تھا از علی گڑھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تحت شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں کافی اشتہار اور دعوت نامے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ طلبا نے جو عظیم خدمات انجام دیں انہوں نے جناح کے کام کو کافی آسان کر دیا اور پاکستان کے نظریے کو عام لوگوں میں اچھا خاصا اجاگر کر دیا۔ متوسط طبقے کی طرف سے زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی اور اب مسلم عوام لیگ کی طرف ایک دوسرے زاویے سے دیکھنے لگے۔ وہاں کے بڑے بڑے زمین دار اور جاگیردار جو لیگ کی صوبائی شاخوں کے عہدے دار تھے، وہ بھی اس خیرہ کن ترقی کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس کا نتیجہ فائدے کی صورت میں بہت جلد برآمد ہوا۔ 1944ء کا سال ختم ہوتے ہوتے پنجاب اور سندھ نے دعویٰ کیا کہ بتدریج دو لاکھ اور تین لاکھ لیگ کے ممبر بنے گئے ہیں۔

مگر طلبا صرف اسی بات پر مطمئن نہ تھے کہ عوام کے دلوں میں پاکستان کی محبت اور مسلم لیگ سے دلچسپی پیدا کریں۔ ان کے خیال کے مطابق نظریۂ پاکستان کے مخالفین کو بھی ایک سبق سکھانا تھا، خاص طور پر صوبے کے ضدی لیڈروں کو۔ پنجاب بھر میں مظاہروں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا جہاں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے عہدے داران جن کی سربراہی میاں بشیر احمد، حمید نظامی، ظہور عالم شہید اور دوسرے کر رہے تھے، نہ صرف یہ کہ پوری طاقت سے مخالف جماعت پر شدید حملہ کیا بلکہ خضر حیات خاں کی وزارت کے خلاف عوامی تحریک شروع کر دی، جو کہ صوبے میں لیگ کی سب سے بڑی رقیب تھی۔ خضر حیات خاں کے خروج نے لیگ کے لیے خوش قسمتی کے دروازے کھول دیے اور پاکستان کا مطالبہ مزید مضبوط ہو گیا۔ جناح صاحب نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ''بے شک یہ طالب علم خود بھی نہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ کامیاب مہم چلا کر ہندوستان کی تاریخ بدل دی ہے۔''

2۔ علماء، پیر اور سجادہ نشیں

وہ علماء، پیر اور سجادہ نشین جنہوں نے خوش آمدید کہا اور پاکستان کے مطالبے کی تائید کی،

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ جناح کا ساتھ دیا اور لیگ کے حق میں فتوے بھی جاری کیے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ بڑی فراخ دلی سے سیاست کے میدان میں چھلانگ لگادی۔ جب کہ چند دیگر علماء، پیر اور سجادہ نشینوں نے ہامی بھری کہ وہ اجتماعی طور پر جمعیت علمائے اسلام کے زیرِ سایہ جو اکتوبر 1945ء میں قائم ہوئی، اس سلسلے میں کوششیں جاری رکھیں گے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان ساتھی جن کا تعلق دیوبند سے تھا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ لیگ کے نظریات کو آگے بڑھایا بلکہ دشمنوں کے حملوں سے جناح صاحب کو محفوظ رکھا اور ان کی حمایت میں سینہ سپر ہوگئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کو پورا اعتماد تھا کہ جناح صاحب ایمان دار اور دیانت دار ہیں اور علامہ اقبال کی طرح وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ جناح وقت حاضری مسلمہ لیڈر ہیں جو آج کے ہندوستانی سیاست سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسی سلسلے میں آگے بڑھ کر انہوں نے جناح کا دفاع کرتے ہوئے، ان کے خلاف ''کافرِ اعظم'' کے لقب کا انتہائی لغو قرار دیا اور ان علماء کے فتوؤں کو رد کردیا کہ لیگ سے تعاون کرنا ''غیر اسلامی'' ہے۔ جناح اور لیگ کی قیادت پر مولانا کا اعتماد اور یقین 46-1945ء کے انتخابات میں سچ ثابت ہوا اور 1947ء کے ریفرنڈم نے بھی یہی نتیجہ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سلہٹ میں دکھایا۔

علماء اور دیگر مذہبی رہنماؤں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا، خاص طور پر سندھ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ لیگ کو ووٹ دیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی بھی شخص جو لیگ کے مخالفین کو ووٹ دیتا ہے، وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا اور قوم کو جواب دہ ہوگا، بلکہ قیامت کے دن بھی جواب دینے کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کرلے۔'' پیغام بڑے والہانہ انداز میں وصول کیا گیا، خصوصاً مسلم عوام کی طرف سے اور وہ بھی دیہاتوں سے سب نے بڑی فراخ دلی سے لیگ کے اُمیدواروں کو ووٹ دیے۔ NWFP میں جہاں لیگ کی کارکردگی اچھی نہ تھی علماء کو ایک بار پھر 1947ء کے آغاز میں اچھی خاصی محنت کرنی پڑی۔ ان علماء میں پیر مانکی شریف، مولانا شبیر احمد عثمانی، پیر جنت علی شاہ اور مولانا عبدالستار نیازی شامل تھے۔ ان لوگوں نے صوبے کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور پٹھانوں کو سمجھایا۔ ''ایک پٹھان پہلے بھی مسلمان ہے اور آخیر میں بھی۔'' چنانچہ اس کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کو ووٹ دے۔ انہوں نے پٹھانوں کو یہ بھی یقین دلایا کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہوگا۔ نتیجہ خلاف توقع یا حسب امید نکلا۔ 1947ء

کا ریفرنڈم لیگ نے بڑی بھاری اکثریت سے جیت لیا۔اس نے 244،289 ووٹ حاصل کیے جبکہ ہندوستان کے حق میں 2,874 ووٹ آئے۔ 99.02% ووٹ ڈالے گئے تھے۔ خدائی خدمت گار اور کانگریس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی کی زیرِ قیادت لیگ نے سلہٹ کی پاکستان سے وابستگی بھی حاصل کر لی۔

3۔ خواتین

اگر چہ بہت سی خواتین ۔79۔1938ء سے ہی لیگ کے ساتھ وابستہ تھیں لیکن اب وہ ایک نئے انداز میں جناح کی پکار پر پاکستان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے اپنی زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ جناح نے اس کے اس رویے کو اپنی تقریر مارچ10 / 1944ء میں اس طرح اجاگر کیا۔

> ''میں آپ کو ایک اہم نکتہ ذہن نشیں کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ کوئی بھی قوم ترقی کے عروج کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ ان کی خواتین بھی شانہ بہ شانہ کھڑی نہ ہوں۔ آپ لوگ عجیب و غریب اور ناشائستہ رسم و رواج میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ انسانیت اور تہذیب کے خلاف ایک جرم ہے کہ ہماری خواتین قیدیوں کی طرح ایک چار دیواری میں زندگی بسر کریں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم مغربی طرزِ زندگی اپنا کر مادر پدر آزاد ہو جائیں۔ ہمیں صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری خواتین اسلامی اصولوں اور قوانین کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔ ہمارے مذہب میں کوئی ایسی شرط یا قانون نہیں ہے جس کے مطابق خواتین شرمناک اور افسوسناک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔''

عورتوں کی اکثریت نے جناح صاحب کی آواز پر لبیک کہا اور اپنی اصلاح کرتے ہوئے لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئیں۔ بعض تو اتنا آگے بڑھ گئیں کہ انہوں نے ملک کی دیگر تنظیموں سے روابط ختم کر لیے۔ نامور خواتین رہنما جو یونینسٹ کے ساتھ تھیں یا کانگریس آل انڈیا وومن کانگریس اور دیگر تنظیموں سے تعلق تھا، وہ دوڑ کر لیگ سے آملیں۔ یہاں تک کہ بیگم شاہنواز، جن کو 1941ء میں لیگ سے خارج کر دیا گیا تھا، ڈیفنس کونسل کے ایک واقعہ کی وجہ سے، شرمندہ ہو کر 1945ء میں جناح صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئیں اور لیگ کے لیے خدمات انجام دینے

کی اجازت طلب کر لی۔

خواتین نے 46-1945ء کے انتخابات میں تمام ذرائع استعمال کر ڈالے اور مسلمانوں کو لیگ کی طرف راغب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ خصوصاً شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں۔ یہ دو ایسے صوبے تھے جہاں جیت کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے متعدد گروپ بنا کر اپنے آپ کو منظم کیا اور مختلف حلقوں میں لیگ کے امیدواروں کے لیے ووٹ حاصل کرنے کی مہم پر چل پڑیں۔ مصروف خواتین لیڈر جیسے کہ بیگم تصدق حسین، بیگم شاہ نواز، بیگم بشیر احمد بذات خود لیگی حلقوں میں تشریف لے گئیں اور مسلمانوں کو لیگ کا ساتھ دینے کے لیے زور دیا۔ جن علاقوں میں یہ خواتین نہ جا سکیں، وہاں جانے کی ذمہ داری انہوں نے پنجاب گرلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور خواتین نیشنل گارڈ کو سونپ دی۔ یہ دونوں تنظیمیں لیگ کی معاون تھیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ ان کی محنت رائگاں نہیں گئی ہے۔ انہوں نے اپنی توجہ اس پر مرکوز رکھی کہ خواتین ووٹرز کی فہرست میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے خواتین کو پولنگ اسٹیشن لانے لے جانے کے لیے گاڑیوں کا بندوبست بھی کیا تا کہ لیگ کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ ووٹ پڑیں۔ چنانچہ نتیجہ کافی امید افزا اور حوصلہ افزا نکل آیا۔ لیگ نے پنجاب کی قانون ساز اسمبلی میں ایک زبردست اکثریت حاصل کی اور اس کی دو خاتون اُمیدواروں نے کافی زیادہ ووٹ حاصل کیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں حالات ذرا ناگوار سے رہے۔ خواتین کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود جس کی سربراہی بیگم عبداللہ ہارون کر رہی تھیں، لیگ کو قانون ساز اسمبلی میں اکثریت نہ مل سکی۔ لیکن خواتین نے ہمت نہ ہاری اور دباؤ جاری رکھا، یہاں تک کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو استعفےٰ دینا پڑا اور صوبے نے آخرکار 1947ء میں لیگ اور پاکستان کے لیے ووٹ دے دیا۔ مگر اس اثنا میں ان کو ایک اور نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ وہ یہ کہ خضر حیات خاں نے جو اگرچہ انتخابات میں عبرت ناک شکست کھا چکے تھے، قانون ساز ادارے کے دیگر غیر مسلم ممبران کے ساتھ مل کر نئی وزارت بنالی۔

8/مارچ 1946ء کو لاہور میں پنجاب صوبائی خواتین سب کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا جس میں ''غیر آئینی اور غیر منصفانہ'' اقدام کی مذمت کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ صوبے بھر میں ایک زبردست عوامی تحریک چلائی جائے گی۔ یہ تحریک آغاز میں ذرا کمزور دکھائی دے رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کی

قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر صوبائی حکومت نے 24/ جنوری 1947ء میں لیگ نیشنل گارڈ کی ایک امدادی جماعت، مسلم نوجوانوں کی طلب کر لی، جو کہ غیر قانونی تنظیم تھی۔ خواتین نے پورے پنجاب میں جلسے جلوس کی بھر مار کر دی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ گرفتاریاں تیزی سے شروع ہو گئیں اور اسی قدر زیادہ شور سے یہ مطالبہ زور پڑتا گیا کہ یونینسٹ وزارت کو برطرف کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی انتظامیہ کو صورتِ حال سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ فروری 1947ء میں چند خواتین سول سیکریٹریٹ لاہور سے یونین جیک اتارنے میں کامیاب ہو گئیں اور اس کی جگہ لیگ کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ اس اقدام نے یونینسٹ وزارت کی قسمت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اب اس وزارت کے لیے مزید کام کرنا مشکل ہو گیا اور اس نے مجبور ہو کر لیگ کے رہنماؤں اور کارکنوں کو رہا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی 28 فروری کو یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا کہ مسلم نیشنل گارڈ غیر قانونی نہیں ہے۔"3 / مارچ کو یونینسٹ وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔

صوبہ سرحد میں خواتین نے اپنی عوامی تحریک فروری 1947ء میں شروع کی۔ صوبے میں سیاسی حالات 47-1946ء کے انتخابات کی وجہ سے سخت کشیدہ تھے۔ جنوری 1947ء میں صوبائی حکومت کی مداخلت کے باعث معاملہ اور بگڑ گیا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ایک سکھ لڑکی کو جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی کا نام "اسلام بی بی" رکھا گیا تھا، اس کے سکھ رشتہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس بنا پر خواتین نے حکومت کے خلاف ہنگامہ کر دیا۔ انہوں نے حکومت پر الزام لگایا کہ وہ مسلم دشمن پالیسی کو ہوا دے رہی ہے اور کانگریس کے ہندوؤں اور سکھوں کی حمایت میں مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ حکومت جو پہلے ہی مشکل حالات سے دوچار تھی، جواب میں جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے اور دفعہ 144 نافذ کر کے سیاسی جلسے جلوس اور احتجاج پر صوبے بھر میں پابندی لگا دی۔ لیگ کے سینکڑوں کارکن اور چند سرکردہ قائدین، جن میں خان عبدالقیوم خاں، ثمین جان، اور پیر مانکی شریف شامل تھے، ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن خواتین ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھیں۔ خان صاحب کے فوری استعفیٰ کے مطالبے کے ساتھ ہی انہوں نے پشاور کے ہر نمایاں سرکاری دفاتر کے سامنے احتجاج کرنا اور جلوس نکالنا شروع کر دیا۔ پنجاب میں بھی یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ انہوں نے پنجاب میں بھی لیگ کا جھنڈا لہرانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں یہ ناممکن تھا کہ چند چیدہ خواتین باہر نکلیں اور احتجاج کریں۔ "اعلیٰ

متوسط طبقے کی خواتین سیڑھیوں کے ذریعہ جیل کی دیواروں پر چڑھ گئیں جہاں سیاسی شخصیات قید تھیں اور لیگ کا جھنڈا لہرادیا۔" معاملہ تین اپریل کو عروج پر پہنچ گیا جب ایک بہت بڑے اور ہنگامہ خیز جلوس نے ڈاکٹر خان صاحب کی رہائش گاہ پر ہلہ بول دیا اور لیگ کا جھنڈا لہرادیا۔
91۔اپریل 1947ء کے آخر میں، ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten) اوراس کے حواری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مسلم لیگ کا ایک عظیم مظاہرہ، پشاور میں جاری ہے، جس میں مختلف گروپ کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

خواتین کی قیادت، جوش اور ولولے سے بھرپور، بیگم زری سرفراز، بیگم ممتاز جمال اور بیگم شیریں وہاب کررہی تھیں جن کو لیگ کی حمایت حاصل تھی۔ اس جلوس نے وائسرائے کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اب صوبے میں ریفرنڈم بے حد ضروری ہے۔ جون چار 1947ء، نے جناح کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سول نافرمانی تحریک شروع کردی اور لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ اپنے آپ کو ریفرنڈم کے لیے تیار کرلیں۔ ہنگامے شروع ہوگئے اور سب نے آنے والے ریفرنڈم کا استقبال کرنے کی تیاری کرلی۔ عوامی جلسے منعقد ہونے لگے اوران سب نے مل کر وہ ہنگامہ بپا کردیا کہ ڈاکٹر خان صاحب کو دفاعی انداز اختیا کرنا پڑا۔ انہوں نے مدد کے لیے قائم مقام گورنر سے رابطہ کیا کہ وہ کوئی حل نکالیں، مگر یہ سب رائیگاں چلا گیا۔ یہ سرگرم اور جفاکش خواتین پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی حمایت میں بے پناہ ووٹ آئے۔ انہوں نے تائید کردی کہ جناح نے ان پر جو بھروسہ کیا تھا، وہ واقعی اس کی اہل تھیں۔

طلباء، علماء، پیر، اور سجادہ نشینوں اور خواتین کی بے پناہ اور پرجوش حمایت نے جناح پر ثابت کردیا کہ ان کی اپیل نے اپنا اثر پورے زوروں سے دکھایا ہے اور اب ان کی سیاسی طاقت اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کو کوئی طاقت نظر انداز نہیں کرسکتی۔ مگر جناح ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی اپیل کا اثر مزید پھیلے اور مسلم معاشرے کے ایک ایک فرد تک یہ پیغام پہنچ جائے تاکہ ان کا سیاسی شعور بلند ہو۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ جوش وجذبہ صنعتی اور کاروباری حلقے میں بھی پہنچ جائے۔ مزدوروں اور کسانوں پر بھی اثرات مرتب ہوں اور مسلم نوجوان بھی اس کے ہم خیال ہوجائیں۔ اس پیغام کا یہ دوسرا مرحلہ تھا، ایک متوازن ڈھانچہ۔

سب سے پہلے ہم صنعت وحرفت اور تجارت کرنے والے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس

امر میں کوئی شک نہیں کہ صنعت وحرفت کے میدان میں زیادہ تر اور تجارت میں تقریباً پورے کے پورے، رقم کے لین دین سے لے کر پیداوار اور سامان تجارت کی فروخت، خام اور تیار، سب کچھ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان زیادہ تر، جوٹ، روئی اور اناج سبزی وغیرہ کا کاروبار کر رہے تھے، جو کہ ان سے ''استحصالی قیمت'' پر خرید لیا جاتا تھا، بلکہ ہندو صنعت کار اور تاجر زیادہ سے زیادہ رعایت مانگ لیتے تھے۔ جوٹ کا معاملہ یہ تھا، مثال کے طور پر ایک سو گیارہ جوٹ ملز جو 69,000 لومز پر مشتمل تھیں، ان میں سے صرف دو ملین مسلمانوں کی ملکیت تھیں، جس میں سے ایک پانچ سو لومز کی تھی اور دوسری ایک سو پچاس لومز کی۔ ان میں سے کوئی ایک مل بھی مسلم بنگال کے علاقے میں نہیں تھی۔ چائے کے کاروبار کی حالت بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار تھی، حالانکہ یہ بھی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔ چائے کے بڑے باغات کے مالک بس دو تین ہی مسلمان تھے، بقیہ چائے کی پوری پیداوار جو 561,740,000 پونڈ تھی، 1947ء میں، ہندوؤں اور برطانیہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔

دیگر صنعت وحرفت کے میدان میں جس میں، کان کنی، انجینئرنگ، سیمنٹ وغیرہ شامل ہیں، مسلمانوں کی حالت اور بھی قابل رحم تھی۔ تجارت اور تجارتی خدمات میں بھی بس دل کو تسلی دینے والی بات تھی۔ مسلمان عام طور پر چھوٹی موٹی تجارت کرتے تھے۔ زیادہ تر پرچون فروش اور خوردہ فروش تھے، جس کا زیادہ تر دارومدار ہندو سوداگروں سے سامان کی فراہمی پر تھا۔ ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ وہ لیگ سے مالی معاونت کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہندو ساہوکاروں کو خبر نہ ہو جائے۔ پورا تجارتی نظام ان اصولوں پر تیار کیا گیا تھا کہ تمام فوائد ہندوؤں کو حاصل ہوں۔ مسلمانوں کا صرف ایک بینک تھا، حبیب بینک، جس کا پورے ہندوستان میں ہندوؤں اور انگریزوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بے شک انشورنس کی تین کمپنیاں مسلمانوں کی تھیں، ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی، حبیب انشورنس کمپنی اور مسلم انشورنس کمپنی، مگر یہ چھوٹی چھوٹی کمپنیاں تھیں، بلکہ اس وقت جو غیر مسلموں کی سب سے چھوٹی کمپنی میدان میں تھی، یہ اس کے مقابلے میں بھی کچھ نہ تھیں۔

صنعت وحرفت اور تجارتی صورت حال دیکھ کر جناح صاحب بے حد پریشان اور غم زدہ تھے، خاص طور پر جب انہوں نے ہندو طبقہ کا رویہ دیکھا۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''

ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک کروڑ پر مشتمل ایک مضبوط قوم ہیں، اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہندوستان بھر میں موجود بے شمار بینکوں میں سے ہمارے پاس صرف ایک بینک ہے۔'' ایک بار پھر تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے انہوں نے کہا'' اَن گنت دولت مند تاجروں کے درمیان کوئی ایک مسلمان ایسا نظر نہیں آتا ہے جو کسی بھاری صنعت کا مالک ہو۔ عظیم اور بھاری صنعتیں ایک قوم کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوتی ہیں۔'' جناح صاحب صنعت وحرفت اور تجارت کی افادیت کو صرف اپنی بقا کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مجموعی طور پر پوری فرقے کی افادیت کے نقطہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے تجارت پیشہ اور صنعتی کاریگروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' آپ کو اپنے تجارتی ادارے اور فیکٹریاں قائم کرنی چاہئیں جہاں آپ ہزاروں دوسرے مزدوروں اور کارکنوں کو بھرتی کر سکیں، ان کے علاوہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی، کیونکہ وہ روشن مستقبل کی تلاش میں ہیں اور اپنے پیشے میں ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے عہدوں میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اب جناح کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی، چنانچہ انہوں نے بھی کاروباری اور صنعتی اور تجارتی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ بے شمار سیاسی مصروفیات، جن کا بوجھ چالیس کے عشرے کے وسط میں ان کے کاندھوں پر تھا۔ انہوں نے تاکید کی اور اصرار کیا کہ مسلمان اپنے آپ کو آل انڈیا فیڈریشن کے سائے تلے ایک ایوان تجارت بنا کر منظم کریں۔ انہوں نے اصفہانی کی مثال دی جو کہ ایک نمایاں تاجر تھے۔ 15 / اپریل 1945ء کو جناح نے بڑے پر زور اور سخت لہجے میں کہا۔'' کیا ابھی تک تم مسلم ایوان تجارت کے خیال کو دبا کر سو رہے ہو۔ کیا یہ سب کچھ صرف خواب وخیال ہی رہے گا؟ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ پہلی میٹنگ کے بعد اتنا لمبا وقفہ کیوں آ گیا ہے۔ گزرنے والا ہر ہفتہ لوگوں میں مایوسی اور بددلی پھیلا رہا ہے اور وہ لوگ کافی دل گرفتہ ہیں جو اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے تھے اور جنہوں نے اس پر کام کیا ہے اور مزید جان لگانے کو تیار ہیں۔ لیکن بجائے کے کہ تیزی سے ترقی ہوتی، کام مزید سست ہو گیا۔ مسلم ہندوستان کے حق میں اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' انہوں نے اصفہانی کو خط لکھ۔'' مجھے امید ہے کہ آپ اس کی اہمیت کا احساس کریں گے اور ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کو بحفاظت پار لگانے کا کارنامہ انجام دیں گے۔ ہمیں بلا معاوضہ اور خلوص دل سے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔''

بالآخر جناح، آل انڈیا فیڈریشن مسلم چیمبرز آف کامرس قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔" تجارت کی ایک اور منزل طے ہوگئی۔" اس مرکز کے سائے تلے انہوں نے کئی تجارتی اور صنعتی ادارے قایم کیے۔ انہوں نے مسلمانوں کو خصوصی ہدایت دی کہ بینکوں کے قیام پر زور دیں، چنانچہ جولائی 1947ء میں مسلم کمرشیل بینک وجود میں آیا۔ اس کے بعد مسلم اسٹیم شپ کمپنی اور اورینٹ ایرویز، مسلمانوں کی ایئر لائن"۔ اب ہم صحیح سمت کی جانب جارہے ہیں۔" انہوں نے اصفہانی سے کہا۔ "مسلمان بحیثیت قوم اپنی شناخت پیدا کر رہے ہیں اور اب وہ اپنے لیے الگ ریاست مانگنے کے مطالبے پر حق بجانب ہیں، ایک ایسی سرزمین جہاں وہ اپنی روایات اور تہذیب وتمدن کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسی ریاست اس وقت تک بیکار ہے جب تک کہ وہاں آبادی نہ ہو، اشیائے ضروری اور دیگر وسائل نہ ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک بھی ایئر لائن نہیں ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ کتنے مسلم پائلٹ اور میکنک اس ملک میں موجود ہیں؟ جب ہم اپنے وسائل اور ہنرمند افراد کے بارے میں جانتے ہی نہیں ہیں جو ایک قوم کی بنیاد کے لیے ضروری ہیں تو ہم کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں؟" جناح نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ مجوزہ ہوائی جہاز کی کمپنی میں کچھ حصے خرید لیں تاکہ یہ اظہار ہوجائے کہ انہوں نے مالی طور پر بھی مسلم عوام کی کوئی خدمت کی ہے۔ اس ایئر لائن نے 1947ء میں کراچی کو اپنا مستقر بنا کر کام شروع کردیا اور درمیان میں کوئی وقفہ نہ آیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اس کو ایک نئی کارپوریشن "پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز" میں ضم نہ کردیا گیا۔ تقسیم کے بعد بہت دنوں تک مشرقی اور مغربی پاکستان رابطے کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ ایسی صورت میں نئی ریاست کو سنبھالنے میں اس ایئر لائن کی کارکردگی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی ریاست بنانے کی تیاری کے لیے جناح ہر وہ قدم اٹھا رہے تھے جو ریاست کے ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے ضرور تھا۔ انہوں نے بذاتِ خود، اصفہانی خاندان، حبیب برادران، آدمجی، اور کئی دیگر بڑے بڑے مسلمان تاجروں کو ترغیب دی اور انہیں اکسایا کہ وہ آگے بڑھیں اور کوئی ایسا کارنامہ انجام دیں کہ تاریخ انہیں یاد رکھے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے دیگر ممالک میں رہنے والوں کو بھی دعوت دی کہ اگر ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ 1944ء کے آغاز میں وہ ایسے "موزوں اور قابل" جوہر کی تلاش میں تھے جو منصوبہ بندی کمیٹی کے اہل کاروں کی تربیت

کر سکیں تاکہ جب نئی ریاست وجود میں آجائے تو پاکستانی علاقوں میں ایسے عملے کی کمی نہ ہو۔105۔ 1947ء کے آغاز میں وہ ماہرین کی پانچ کمیٹیاں بنانے کی تیاری کر رہے تھے جو مستقبل میں پاکستان کے لیے خدمات انجام دے سکیں۔ ان پانچ شعبوں میں خزانہ، کرنسی اور اثاثے اور جائیداد کی تقسیم، مواصلات، ڈاک و تار، شہری ہوابازی، موسمیات اور صنعت و حرفت شامل تھے۔ ان حفاظتی اقدامات نے آگے چل کر پاکستان کی معیشت میں ایک نمایاں اور اہم کردار انجام دیا اور فوری نوعیت کے لحاظ سے مختلف شعبوں میں بھی جناح صاحب کی شکایت دور ہوگئی۔ ان اقدامات کا فائدہ یہ ہوا کہ نئی مملکت کو چلانے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

مالیات اور معاشیات میں جناح صاحب کی دلچسپی نے ہندوستان کے مسلمانوں میں شعور بلند کر دیا۔ لیکن اس میں مزید استحکام پیدا کرنے کے دو اور اہم ستون کی پائیداری کی بھی ضرورت تھی، تعلیم اور سماجی نگہداشت، یہ تینوں زاویے مل کر ایک پائیدار حقیقت بن سکتے تھے۔ انہوں نے کہا اگر یہ تینوں اکٹھے ہوں تو پھر چوتھے ستون یعنی سیاست کو بھی اونچے مقام پر فائز کر سکتے ہیں۔ 107۔ ان کے اس قیاس کی وجہ بڑی ہی آسان تھی اور اکتوبر 1943ء میں انہوں نے بمبئی میں میمن چیمبر آف کامرس کی بنیاد رکھ دی۔

''ایک قوم کی زندگی سے معاشیات، سماج اور تعلیم کو الگ کر دینا ناممکن ہے۔ مسلمان مرد اور عورت ایک دوسرے سے باہم پیوستہ ہیں اور اس بناء پر سیاست بھی ان کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ایک قوم کی تعمیر میں سیاست کے بغیر دیگر معاملات کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ ان تمام معاملات پر دسترس رکھنے کے لیے سیاسی اقتدار اور قوت عوام کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے۔''

جناح صاحب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ چنانچہ انہوں نے تسلیم کیا کہ مسلمان قوم کی حالت سدھارنے میں اس وقت کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کا معرکہ سر نہ کر لیں۔ ان کے اس عزم و استقلال کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب بلوچستان مسلم لیگ نے اپنی کانفرنس منعقدہ جولائی 1943ء میں انہیں ایک تلوار پیش کی۔ یہ ایک تاریخی حیثیت کی حامل تلوار تھی جس کے بارے میں کہا گیا کہ اسلام کے دفاع میں یہ تلوار کئی بار استعمال کی گئی ہے۔'' جناح صاحب یہ تلوار لینے کے لیے آگے

نہیں بڑھے، بلکہ انہوں نے فرمایا۔'' یہ تلوار صرف دفاع کے لیے اٹھ سکتی ہے۔ مگر موجودہ دور میں سب سے اہم چیز علم ہے۔ علم و آگہی تلوار سے زیادہ عظیم ہے۔ جاؤ! اور علم حاصل کرو۔ جب اس میں کامیابی حاصل کرلو تب تلوار ہاتھ میں لو جو کہ گزشتہ تیرہ صدیوں سے ہمارے پاس ہماری حفاظت کے لیے موجود ہے۔''

1944ء میں جناح صاحب نے ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی کہ وہ دیکھے کہ ہندوستان میں کون سا طریقہ تعلیم رائج ہے اور اس بات کو مدنظر رکھے کہ موجودہ صورتِ حال میں مسائل کیا درپیش ہیں اور آگے چل کر کون کون سی مشکلات پیش آنے کا امکان ہے۔ اس سلسلے میں وہ ضروری سفارشات مرتب کرے اور بتائے کہ اسلامی روایات کو کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ ان تجاویز پر عمل کرنے کیا صورت ہوگی۔ کمیٹی نے مزید کئی سب کمیٹی بناڈالی، جیسے کہ پرائمری، سیکنڈری ایجوکیشن کمیٹی، خواتین ایجوکیشن کمیٹی، ٹیچرز ٹریننگ کمیٹی، اعلیٰ تعلیمی کمیٹی اور سائنس تعلیمی کمیٹی۔ ان کمیٹیوں نے ماہرین تعلیم سے رابطے کیے اور ترقی و بہتری کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں۔ ظاہر ہے ان اقدامات کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور اس کے نتیجے میں اگلے چند سالوں میں تعلیم کا معیار بلند ہوگیا۔ ہدایات کے مطابق مسلمان شاگردوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا۔ یہ اضافہ ہر سطح پر ہوا، کالج اور یونیورسٹی، نومبر 25 /1945 تک بات یہاں تک پہنچی کہ جناح فخر یہ کہہ سکتے تھے کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو صرف ابھارا ہی نہیں بلکہ ان کو معاشی اور تعلیمی لحاظ سے بھی اس قابل بنادیا ہے کہ وہ کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔

مسلمانوں کے معاشی حالات کو ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے لیگ کے کراچی اجلاس، دسمبر 26-24 /1943ء میں یہ رائے دی گئی کہ لگان کے طریقہ کار میں مزید بہتری کی ضرورت ہے۔ کرائے کی پائیداری، لگان کی ضمانت، مزدور اور زراعت میں ترقی اور قرض کے لین دین پر پابندی۔ مزدور اور کسان، یہ دو طبقے کافی دباؤ میں تھے اور جناح ان کے فلاح بہبود کے لیے کوئی راستہ تلاش کررہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کو حق اور انصاف ملنا چاہیے۔ یہ بات ان کے لیے سخت ناگواری کا باعث بن رہی تھی کہ ان کے حقوق کو پامال کیا جارہا تھا، چنانچہ انہوں نے ہر اس منصوبے کی حمایت کی جس میں کاشت کار اور کسان کے حقوق کی حمایت کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس حرکت کو بھی رد کردیا جس میں زمین دار طبقے والے ناجائز شرائط رکھ کر ان کا

استحصال کر سکیں۔

''عوام کے ساتھ انتہائی ظالمانہ اور سفا کانہ برتاؤ ہو رہا ہے۔ وہ اسلام کا دیا ہوا سبق بھول چکے ہیں۔ لالچ، ہوس اور خودغرضی نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور وہ مزدوروں کو اپنی رعایا سمجھنے لگے ہیں۔ آپ ملک کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، آپ کو لاکھوں ایسے افراد مل جائیں گے جو ایک وقت کی روٹی سے بھی محروم ہیں۔ کیا اسی کا نام تہذیب اور انسانیت ہے؟ کیا پاکستان میں بھی ایسا ہی ہوگا؟ اگر وہاں ایسا ہوا تو مجھے ایسے پاکستان کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کے اندر ذرا بھی عقل اور سوجھ بوجھ ہے تو نئے زمانے کے حالات کو سمجھیں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیں۔''

جناح صاحب کا اظہار ناراضگی صرف زمین داروں اور جاگیرداروں کی کم ظرفی اور تنگ ذہنیت کی طرف نہیں تھا، بلکہ وہ پنجاب اور بنگال صوبائی لیگ کے منشور کی طرف بھی توجہ مبذول کروا رہے تھے۔ وہ مسلمان کاشت کاروں اور مزدوروں کو بتانا چاہ رہے تھے کہ ان کے دکھوں کا مداوا صرف اور صرف لیگ ہی کے پاس ہے۔ اگر وہ اسلام کے قواعد وضوابط کا پاس کریں اور مسلم لیگ سے دور نہ جائیں تو اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ ایک ہم عصر اہلِ نظر نے اس بات کو زبردست اہمیت دی اور تعریف کی۔ ظاہر ہے اس نے ان باتوں میں چھپے ہوئے جوہر بات کو دریافت کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر بنگال کے معاملے کو لے لیں۔ ابوالہاشم جو بنگال صوبائی مسلم لیگ کے سیکریٹری تھے، انہوں نے اپنی سالانہ رپورٹ 1944ء میں دعویٰ کیا کہ لیگ عوامی تحریک میں ایک انقلاب لے آئی ہے اور پانچ لاکھ پچاس ہزار ممبر اس میں شامل ہو چکے ہیں، اور یہ تعداد کسی بھی ایک تنظیم کے ممبران سے زیادہ ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ''یہ مسلم لیگ سے مسلمانوں کی چاہت اور جاں نثاری کا ثبوت ہے۔''

جناح صاحب نے اپنی بھرپور کوششیں مسلم ہندوستان کو لیگ کے سائے تلے لانے کے لیے صرف کر دیں۔ جنگ کے دوران انہیں جو مواقع برطانیہ اور کانگریس نے دیے، اس کا انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ کانگریس کی طرف سے پہلا اور سنہری موقع انہیں اس وقت ملا جب اس نے 1939ء میں برطانوی حکومت کے خلاف ردِعمل کے طور پر وزارت سے استعفےٰ دے کر فراہم کیا۔ فیصلہ ہندوستان کی طرف سے جنگ میں شامل ہونے کا تھا اور اس طرح مسلم لیگ کے لیے میدان

خالی کر دیا۔ جناح صاحب نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس کو ''یومِ نجات'' قرار دیا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلم اکثریتی صوبوں میں اپنی وزارت قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، جیسے کہ آسام، سندھ، بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ صرف صوبہ پنجاب میں لیگ اپنے قدم نہ جما سکی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وہاں بھی ایک ہلکا پھلکا اتحاد یونینسٹ کے ساتھ قائم تھا جس کو جناح + سکندر معاہدے کا نام دیا گیا تھا۔ اس طرح گویا مسلم اکثریت کے وہ تمام صوبے لیگ کی وزارت میں آ گئے تھے جو کہ پاکستان کے منصوبے میں شامل تھے۔ لیگ کی بالیدگی میں اس واقعے نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے صوبائی لیگ کی قیادت کو ابھر کر سامنے آنے کا موقع دیا اور ان کی ہمت افزائی ہوئی کہ وہ اپنے کام کو اور تیزی سے آگے بڑھائیں اور اس کی ترقی کے لیے دن رات ایک کر دیں۔ دوسری بات یہ کہ جناح صاحب کو پہلی بار یہ موقع میسر آیا کہ وہ مسلم اکثریت کے صوبوں کا کنٹرول براہِ راست سنبھال سکیں، اور اس طرح دیگر پارٹیوں پر یہ تاثر قائم ہوا کہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں لیگ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ شش و پنج میں پڑے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو پیغام ملا کہ لیگ ایک طاقت ور جماعت ہے اور اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام عوامل نے مل کر برطانیہ اور کانگریس کو یہ واضح پیغام دیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا لیگی مطالبہ محض ایک دماغی اختراع نہیں بلکہ ان مسلم اکثریت کے اصولوں کا ایک جائز مطالبہ ہے۔ اب کانگریس جان گئی کہ اب وہ مسلم اکثریتی صوبوں کو دبا نہیں سکتی سوائے اس کے کہ قتل و غارت کرے اور ملک کو ایک خونیں خانہ جنگی میں دھکیل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے۔

وزارت سے استعفیٰ کے بعد کانگریس کی برطانیہ سے 1941ء اور 1942ء میں بات چیت بھی ناکام ہو گئی، اور تب کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ اگست 8/1942ء سے ایک تحریک نافرمانی شروع کرے گی اور برطانیہ سے مطالبہ کرے گی کہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' مگر اس نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ مسلمانوں کو اعتماد میں نہیں لیا۔ کانگریس کی اس حرکت نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ برطانیہ سے لڑائی دراصل مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔ جناح نے بھی دانستہ طور پر ان افواہوں کو پھیلنے دیا تاکہ کانگریس کے مطالبے کا اصل چہرہ سامنے آ جائے اور برطانیہ کا بھی کہ وہ طاقت اور اقتدار ہندوؤں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک پر مسلمانوں

کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ 39-1937ء کے دوران تھا جب کانگریس نے صوبوں میں اپنی حکومت کے دور میں مسلمانوں پر دہشت طاری کی ہوئی تھی۔ تحریک کا یہ ناگہانی اعلان ''بغیر ان سے بات چیت کیے اور مشورہ کیے۔'' اچھے بھلے مسلمانوں کو حیرت اور پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ کانگریس کے رویے میں مسلمانوں کے خلاف جو بغض چھپا ہوا تھا، وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ جو بھی خیالی پیکر اب تک مسلمانوں کے ذہن میں سمایا ہوا تھا، کانگریس نے وہ سب چکنا چور کر دیا۔ یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد کانگریسی لیکن مخلص مسلمان لیڈر کو بھی اب سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان کے مکر و فریب میں نہ آئی اور رفتہ رفتہ لیگ کی طرف کھسکتے چلے گئے۔ اب وہ لیگ اور جناح کی طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں مسلم لیگ ہی بلا شک وشبہ ان کی واحد نمائندہ تھی۔

جنگ کے دنوں میں کانگریس کے قوانین یعنی کہ جنگ میں جانے کی اجازت یا بدفال کو چھوڑ کر، جنگ نے جناح کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا کہ وہ لیگ کے لیے مزید حمایت حاصل کر سکیں۔ جنگ کے دوران کانگریس کے رویے کو دیکھتے ہوئے برطانیہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ملک کی دیگر جماعتوں کی خوشامد کرے، خاص طور پر جناح کی، اس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ جناح ایک ایسی پارٹی کے سربراہ تھے جو کل ہند کی بنیاد پر کانگریس کے بعد دوسری بڑی پارٹی تھی اور یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے ان کی ایک خاص اہمیت تھی۔ مسلمان اگرچہ اقلیت میں تھے لیکن انہوں نے برطانوی فوج کا اسی قدر ساتھ جتنا کہ ہندوؤں نے۔ برطانیہ نے اس حقیقت کو اپنے ملک اور ہندوستان میں دونوں جگہ تسلیم کیا۔ جناح اس کی تنقیدی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ تھے۔ 13/ ستمبر 1942ء کو انہوں نے ایک برطانوی نمائندے کو کہا، جو یہ جاننا چاہتا تھا کہ لیگ کے فیصلے کا مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ''اگر لیگ کی یہ مہم چل پڑتی ہے دفوج کے ساتھ ساتھ پورا سرحدی علاقہ اس سے متاثر ہو جائیگا اور بہت سے مسلم ممالک، جیسے کہ افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر اس کے زیر آ جائیں گے۔ اگر مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیگ کانگریس کی نسبت پانچ سو فی صد زیادہ مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔''

جناح صاحب نے بہت جلدی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ لیگ کے پاس جنگ میں شامل ہونے

کا موقع آ گیا ہے اور برطانیہ کو اس کی حمایت کی سخت ضرورت ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ماننے والوں کے سامنے وضاحت کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا کہ وائسرائے کے اس دعوت نامے کے پیچھے فوری طور پر جنگ کا اعلان پوشیدہ ہے۔

''جنگ کا اعلان کرنے کے بعد، قدرتی طور پر وائسرائے مسلم لیگ کی حمایت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ مسلم لیگ ایک زبردست قوت کی مالک ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات نظر میں رہے کہ جنگ کا اعلان کرتے وقت، وائسرائے میرے بارے میں نہیں بلکہ صرف اور صرف گاندھی کے بارے میں سوچ رہے تھے، ایک مناسب مدت تک میں قانون ساز اسمبلی میں ایک اہم پارٹی کی قیادت ضرور کر رہا تھا، اور مسلم لیگ پارٹی، مرکزی قانون ساز اسمبلی میں اب بھی ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس کے باوجود وائسرائے کی نظروں میں یہ نہیں آئی۔ لہٰذا جب گاندھی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی دعوت نامہ ملا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میرے اوپر یہ مہربانی کیوں کی جا رہی ہے۔''

لیکن اس کا مطلب بھی نہیں کہ جناح صاحب برطانیہ کی جنگی جنون سے متفق تھے۔ وہ اس وقت تک کچھ کرنے پر راضی نہ تھے جب تک کہ برطانیہ بھی اس کے بدلے میں مسلمانوں کو کوئی تحفہ پیش کرے۔ ''ان کی طاقت کو تسلیم کرے اور ملک کی حکومت میں ان کا جائزہ حصہ عطا کرے۔'' اگست 8/1940ء کو برطانوی حکومت کھلے عام یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئی کہ ''وہ امن اور فلاح کے نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کو ذمہ داری نہیں سونپ سکتے ہیں جب تک کہ ہندوستان کی قومی زندگی میں کوئی بھونچال نہیں آ جاتا۔ نہ ہی تشدد پسند عناصر کے ساتھ حکومت بنانا پسند کریں گے۔'' ایک مصنف کی تحریر کے مطابق ''یقیناً جناح نے یہ عروج اپنی شاندار حکمت عملی کے باعث حاصل کیا۔''

چنانچہ جناح نے اگست میں پیش کی گئی اس پیش کش کو قبول نہیں کیا کیونکہ اس میں لیگ کو ضمانت نہیں دی گئی تھی ''کہ ان کا اصل مطالبہ اور ملک کی حکومت میں ان کا حصہ دیا جائے گا۔'' اور یہ کہ برطانیہ واقعی کسی حقیقی یا معقول حاکم کو مرکز میں اختیارات دینا نہیں چاہتا کیونکہ گزشتہ مظاہروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، پانسہ الٹ بھی سکتا ہے۔ چنانچہ مرکز میں لیگ کے اثرات باقی رہنے تک کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ درحقیقت 1940ء کے آغاز میں، وائسرائے، ''مسلم

لیگ کے کسی لیڈر سے کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔'' کہ وہ مجوزہ وسیع ایگزیکٹو کونسل اور وار ایڈوائزری کونسل میں شریک ہوں گے۔''اور لیگ فرمان سے سرتابی کریں گے۔''

مرکز میں پیش آنے والے آئندہ کے واقعات، 1942ء میں کرپس مشن ( Cripps Mission) 1945ء میں شملہ کانفرنس اور 1946ء میں کیبنٹ مشن ( Cabinet Mission) محض لیگ کی حیثیت پر صداقت کا ٹھپہ لگانے کے مترادف تھے۔ لیگ وہ پارٹی تھی جس سے مسلمانوں کا تعلق تھا۔ 1946ء کے اواخر میں یہ واقعی ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل نمائندہ جماعت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ صوبائی اسمبلیوں میں مسلم نشستوں کی اکثریتی تعداد اسے حاصل تھی۔ مجموعی طور پر پانچ سو تینتیس مسلم نشستوں میں سے چار سو ساٹھ اس کے ہاتھ میں تھیں، مرکز اور صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں یہ نتیجہ برامد ہوا تھا۔ اس کا تناسب چھیاسی فی صد بنتا تھا۔ جو ووٹ ڈالے گئے، ان کا تناسب چھیاسی اعشاریہ سات فی صد بنا جو کہ مسلمانوں نے مرکزی اسمبلی میں ڈالے تھے اور چوہتر اعشاریہ سات فی صد صوبائی اسمبلی میں یہ اس کے مقابلے میں ایک بہترین کارکردگی تھی جب 1937ء کے انتخابات میں صرف چار اعشاریہ چار فی صد ووٹ پڑے تھے۔ ''اگر کسی کو یاد ہو'' زیڈ۔ اتچ۔ زیدی لکھتے ہیں وہ لیگ جو 1935ء میں غیر منظّم اور کمزور تھی اس کے ممبران بھی کم تعداد میں تھے اور ان کی آواز بھی دور دور سنائی نہیں دیتی تھی، ایسی جماعت نے ایک انقلابی کارنامہ دکھادیا اور مسلمانوں کی سیاست کو دس سال کے عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچادیا۔'' نتیجہ درحقیقت کسی شک وشبہ سے بالاتر تھا اور یہ جناح کی بے پناہ لگن اور انتھک محنت ہی تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑادی۔ جناح خود بھی خوشی کے مارے پھولے نہ سمارہے تھے۔ اب میں صرف ایک بار کہوں گا۔ انہوں نے ''لیگ لیجلیسٹرز کانونشن'' میں اعلان کیا جو کہ دہلی میں 9، 7 اپریل 1946ء میں بلائی گئی تھی۔ یہ دن آ گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی طاقت یا قوت موجود ہے جو ہماری منزل مقصود پاکستان کو ہم سے دور کرسکے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ منزل بہ منزل فتح کی جانب گامزن ہوتے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ پاکستان حاصل کرلیں گے۔

◆◆◆

# قائداعظم کا تصورِ مذہب

یوسف راہی چاٹگامی

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآنِ کریم مسلمانوں کا دین، ایمان اور قانونِ حیات ہے یعنی معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکامات کا مجموعہ ہے اور اسلام محض عقائد یا چند مراسم عبودیت کے ادا کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جسے خالقِ کائنات نے آج سے چودہ سو برس پیش تر اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کیا اور اسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی تیئس سال کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کے بعد تمام شعبہ ہائے زندگی میں جاری و ساری کیا اور اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دکھایا۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد خداوندِ کریم نے یہ مقرر کیا ہے کہ وہ اس نظامِ حق کو نہ صرف اپنی زندگیوں میں نافذ و جاری رکھیں گے بلکہ پوری سرزمین پر اس کا نافذ کرنا ان کی ذمے داری ہوگی۔

مسلمانانِ ہند اپنے عقائد کو اکھنڈ بھارت میں رہ کر ہندوؤں کی یا انگریزوں کی غلامی میں ہوتے ہوئے کسی طور پر بھی پورا نہیں کر سکتے تھے چناں چہ انہوں نے ایک خطۂ اراضی کے حصول کی خاطر جدوجہد کی تاکہ پہلے وہ اپنے گھر میں اس دین کو مکمل طور پر نافذ کریں اور جب دنیا اس کی برکتوں کا مشاہدہ کرنے لگے تو پھر اسے لے کر چاردانگِ عالم میں پھیل جائیں۔

سید احمد شہید سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت تک مسلمان مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ اس راہ میں انہیں نقصان کی صورت بھی دیکھنی پڑی اور جامِ شہادت بھی نوش کرنا پڑا۔ آخر کار خدا نے مدد فرمائی، مسلمانانِ ہند اپنے مقصد میں کام یاب ہو گئے اور انہیں 14 / اگست 1947ء کو آزادی نصیب ہوئی۔

گویا پاکستان کے حصول کا واحد مقصد قرآنی اُصول کے مطابق حکومتِ عادلہ کا قیام تھا۔اس کے سوا اور کوئی مقصد کارفرما نہیں تھا۔قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک یعنی اس ۷۰ سالہ دور میں ہم نے جمہوریت کا بھی تماشا دیکھا اور مارشل لا کا بھی۔ یہ ہمارے لیے باعثِ شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ جس مقصد کی خاطر ہم نے ایک علیحدہ خطۂ اراضی کے حصول کے لیے لاکھوں قیمتی جانوں کی قربانیاں دیں وہ مقصد اب تک ہم حاصل نہیں کر سکے، کیا اس ۷۰ سالہ دور میں پاکستان میں مکمل نفاذِ اسلام کا قیام ممکن نہ تھا؟

پاکستان بننے کے بعد ہی سے کچھ لادین عناصر جن کے نزدیک نظریۂ پاکستان کی کوئی وقعت نہ تھی ببانگِ دہل پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ قرار دینے لگے۔ملک میں جب بھی نفاذِ اسلام کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو انہوں نے اخباری بیان دینا شروع کر دیا کہ ''قائداعظم پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔''

آیئے ہم ارشاداتِ قائداعظم کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی قائداعظم نے پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کی خاطر طویل جدوجہد کی تھی اور اپنی جان، جانِ آفرین پاکستان کی چوکھٹ پر نثار کر دی تھی یا ان کا منشا پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام تھا:

> ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعۂ ارضی حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اُصولوں کو اپنا سکیں۔''

(بحوالہ ڈان ۱۴ار جنوری ۱۹۴۸ء)

> میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات قانون عطا کرنے والے پیغمبرِ اسلام کے اُسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہے،ہمیں چاہیے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح اسلامی تصورات اور اُصولوں پر اُستوار کریں۔

(شاہی دربار سبی ۱۴۲/۴۸)

> ''قرآنِ کریم مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے،اس میں مجلس، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرض یہ ہے کہ ہر شعبہ کے احکام موجود ہیں۔مذہبی اُمور سے لے کر روزانہ کے امورِ حیات تک ، روح کی نجات

سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے فرائض و حقوق تک، دنیوی زندگی میں جزا و سزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک، ہر قول و فعل اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔"

(گاندھی جی کے خط سے اقتباس ۴۴ء)

"اگر ہم قرآنِ مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند رہیں اور اس تعلیمِ خداوندی کو فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کرسکتا۔"

(۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء حیدرآباد، دکن)

"میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفساری کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں، اسلامی اُصول تو ایسے ہیں کہ جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کرسکتا۔ یہ اُصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیش تر تھے۔"

(بحوالہ ڈان ۲۶ر جنوری ۱۹۴۸ء)

"اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام کی حکمرانی کے لیے لامحالہ ایک علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

(عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن، ۱۴ء)

"وہ کون سا رشتہ ہے جن سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت اُستوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک کتاب، ایک اُمت۔"

(کراچی مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۴۳ء)

آزادی کی اس سال گرہ پر ہمیں چاہیے کہ ہم خدائے ذوالجلال کے حضور سجدہ ریز ہو کر یہ عہد کریں کہ ہم پاکستان کے آئین پر شریعت کی بالادستی کی خاطر تن من دھن کی بازی لگادیں گے اور اس مقصد کو ضرور پورا کر دکھائیں گے جس مقصد کی خاطر اسلامی جمہوریہ پاکستان حاصل کیا گیا تھا، ورنہ طویل جدوجہدِ آزادی کا مقصد فوت ہو جائے گا اور لاکھوں جانیں جو پاکستان کی بنیاد کو اُستوار کرنے میں کام آئیں اُن کی روحیں ہمیں کبھی بھی معاف نہیں کریں گی۔

◆◆◆

# قائدِاعظم کا تصورِ ریاست

شاعر علی شاعر

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کے افکارِ جدید نے انھیں دیگر سیاسی راہ نماؤں اور صاحبِ اقتدار افراد سے منفرد و ممتاز کر دیا تھا۔ قائداعظم نے اپنے علوم و افکار کی بنا پر اپنے فطین ذہن سے ایسی مشکلات کا حل تلاش کیا جن تک اس زمانے کے عالم و فاضل اور سیاسی بصارت و بصیرت رکھنے والوں کی رسائی تک نہیں تھی۔ دراصل قائداعظم زبانی جمع خرچ کے قائل نہیں تھے، وہ عملی سیاست کے علم بردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قانون اور آئین کی بالادستی کے لیے عملاً کام کیا جس کے لیے اُنھوں نے اپنی زندگی اور تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ وہ شروع ہی سے اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں اور اُن کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کی قربانیوں اور ایثار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قائداعظم نے اپنے علم، قلم، ذہن، قابلیت، صلاحیت اور تمام تر روحانی و جسمانی طاقتوں سے عوام کے حقوق کی جنگ لڑی اور وہ اس میں سرخ رو ہو کر فتح یاب ہوئے۔ یہ قائداعظم ہی کی قربانیوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج ایک علاحدہ ریاست میں آزادانہ سانس لے رہے ہیں اور سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ قائداعظم نے اپنے آخری سانس تک پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو فعال کردار ادا کیا اُسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص قائداعظم کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو وہ محسن کش انسان اور احسان فراموش ہوگا۔ قائداعظم پاکستان سے اِس قدر مخلص و وفادار تھے کہ انھیں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے صرف ایک سال کی مدت نصیب ہوئی، اس ایک سال میں بھی اُنھوں نے پاکستان کو

اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوششیں کیں اور پاکستان کی تشکیل اور تکمیل کے لیے بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ نئے اداروں کی بنیاد رکھنا، نئے مراکز تشکیل دینا، مالی وسائل کی کمی کو اپنی ذہانت سے پورا کرنا، مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور درپیش مسائل کو حل کرنا، یہ سب قائداعظم کی ہمت، ذہانت، سیاسی بصیرت اور دوراندیش طبیعت کے تحت ہی ممکن ہوسکا۔

قائداعظم محمد علی جناح پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو زیادہ تر انگریزی اور کم کتابیں اُردو زبان میں ہیں مگر انگریزی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا اُردو ترجمہ ہونے سے مشکل آسان ہو گئی ہے۔ ان تمام کتابوں کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے جس طرح کا پاکستان بنانا چاہا تھا یا بنایا تھا، یہ پاکستان ویسا نہیں ہے۔ موجودہ پاکستان نہ تو علامہ اقبال کا خواب ہے اور نہ قائداعظم کی عملی سیاست کا نقشہ، اگر پاکستان کو قائداعظم کے افکار کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا ہے تو اس وقت پاکستان خوش حالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا اور ہمارے بعد آزاد ہونے والے ہندوستان سے دوگنی ترقی کر جاتا۔ دراصل ہمیں صرف قائداعظم کی تقریروں کے اقتباسات پڑھائے جاتے رہے ہیں مگر بہ حیثیت گورنر جنرل قائداعظم نے پاکستان کی تشکیل کے لیے جو اقدامات کیے، فیصلے صادر فرمائے، پالیسیاں بنائیں، ہدایات جاری کریں، فائلوں پر اہم اور تاریخی نوٹ لکھے، نئے ضوابط واضح کیے، احکامات جاری کیے اور آئندہ کا لائحۂ عمل اختیار کیا۔ وہ سب تحریریں اور ثبوت کہاں ہیں؟ پاکستان کی نئی نسل کو اِن سب چیزوں اور معلومات و آگہی سے لاعلم کیوں رکھا گیا۔ اگر قائداعظم کی مذکورہ بالا تمام تحریروں کی روشنی میں پاکستان کو چلایا جاتا تو آج پاکستان وہی پاکستان ہوتا جو علامہ اقبال کا خواب تھا اور قائداعظم کی عملی سیاست کی تصویر۔ قائداعظم کے نظریات اتنے جان دار، وسیع اور ان کے خیالات و تصورات اس قدر مضبوط تھے کہ حلیف تو حلیف، حریف بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قائداعظم انسانی حقوق کے لیے ایک اسلامی فلاحی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کے ذہن میں مذہبی جماعتوں کی حکومت کا کوئی تصور تھا نہ قیادت کا۔ پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم نے اپنے قریبی ساتھی

علامہ شبیر احمد عثمانی کو کسی منصب پر فائز نہیں کیا۔

تحریکِ پاکستان کے عظیم راہ نما قائداعظم محمد علی جناح کی نظر میں اس ریاست کی بنیاد جمہوریت تھی۔ لہٰذا انھوں نے جمہوریت کی بقا کے لیے فیصلے صادر فرمائے اور پاکستان کا آئین بنانے کے لیے دستور ساز اسمبلی کو اختیار دیا کہ وہ ایسا آئین بنائے جس میں مسلمانوں کے ملک میں غیر مسلم کو بھی رہنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ ان کی عبادت گاہوں کے قیام پر پابندی نہ ہو۔ قائداعظم کی یہ سوچ سو فی صد اسلامی سوچ تھی کیوں کہ دینِ اسلام نے بھی غیر مسلم کے حقوق کی بات کی ہے۔ حضورِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ قانونی تقاضے پورے کرنے کے احکامات صادر فرمائے ہیں۔ لہٰذا قائداعظم کا پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو امن و امان کا گہوارہ ہو، جس میں انسانی جان کی وقعت ہو، انسان کے حقوق کا خیال رکھا جائے، غیر مسلموں کو مذہبی آزادی حاصل ہو، قائداعظم کا تصورِ ریاست صرف اور صرف جمہوری تھا کیوں کہ قائداعظم جمہوریت پر یقین رکھتے تھے اور انھیں کسی قوم و ملت اور ملک کی سلامتی جمہوریت ہی میں نظر آتی تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے ہمیشہ مسلم قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے جمہوریت کو فوقیت دی۔ اسی تصور کو مرکز و محور جان کر پاکستان حاصل کیا گیا اور ایک جمہوری ریاست معرضِ وجود میں لائی گئی۔ آج پاکستانی عوام، حکومت اور صاحبِ اقتدار لوگ جن نامساعد حالات سے دوچار ہیں اور جن مشکلات کا رونا رو رہے ہیں ان کی وجوہات قائداعظم کے تصورات سے انحراف ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کو استحکام نصیب ہو، خوش حالی کا دور دورہ ہو، پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو، بیرونی خلفشار سے دوچار نہ ہو، بیرونی طاقتوں کے زیرِ اثر نہ رہے اور خود مختار حیثیت سے قائم رہے تو ہمیں تصوراتِ قائداعظم کو اپنانا ہوگا، ان پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ ان کو عملی زندگی میں رائج کرنا ہوگا۔ ان افراد کی بیخ کنی کرنا ہوگی جو تصوراتِ پاکستان اور افکارِ قائداعظم کے مخالف ہیں۔ ایسے افراد کو نہ صرف اقتدار سے ہٹانا ہوگا بلکہ انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانا ہوگا اور ایسے افراد کو صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار بنانا ہوگا جو افکارِ قائداعظم سے متفق ہیں اور حامیانِ قائداعظم میں اُن کا شمار ہوتا ہے، تبھی پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی ریاست بنایا جاسکتا

ہے۔ دشمنانِ پاکستان اور دشمنانِ اسلام سے پاکستان اور مسلمانوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں جمہوریت ہوگی، جہاں جمہوریت ہوگی وہاں انسانی حقوق کی ادائیگی ہوگی۔ جب انسانوں کو ان کے حقوق ملیں گے تو انسان خوش حال ہوگا۔ جب وہ خوش حال ہوگا تو امن پسند زندگی گزارے گا۔

قائداعظم کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُنھوں نے ہمیشہ پاکستان کے لیے اسلامی ریاست کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ مسلم ریاست کے نام سے پکارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی مذہبی جماعتیں اُن کے خلاف ہوگئیں جن میں خاکسار تحریک، جماعت اسلامی، مجلسِ احرار اور جمیعت العلمائے ہند شامل ہیں۔ ان جماعتوں نے مسلم ریاست کا لفظ سن کر سوچ لیا کہ قائداعظم پاکستان کو مذہبی ریاست بنانے کے حق میں نہیں ہے مگر اُنھوں نے اتنا خیال نہیں کیا کہ جو مملکت مسلم ہوگی کیا وہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں ہوں گے؟ ان مذہبی جماعتوں نے قائداعظم کے ان خطبات کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جن میں قائداعظم نے واضح طور پر اسلام، قرآن اور قرآن و حدیث کی بات کی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ پاکستان ایک مسلم ریاست ہوگا جس میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے، لہٰذا پاکستان کا قانون اور آئین قرآن و سنت کی روشنی میں ترتیب دیا جائے گا۔ دراصل مذہبی جماعتوں کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ قائداعظم کے ذہن میں اسلام کا جو تصور تھا وہ کٹر مذہبی راہ نماؤں سے مختلف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے اپنے خطبات میں عبادات پر کم اور معاملات پر زیادہ زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلام کے بنیادی اصول قائم ہوں جن کی روشنی میں مساوات کا دور دورہ ہو، کسی کے ساتھ غیر مساویانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اُخوت قائم ہو، بھائی چارے کی فضا میں زندگی گزاری جائے۔ باہمی تعاون ایک دوسرے کو حاصل ہو۔ عدل و انصاف ہو، ہر ایک کو انصاف فراہم کیا جائے، یہ نہ ہو کہ کسی بااثر شخصیت کے جرم کو معاف کر دیا جائے اور عام اور غریب انسان کو سزا سنا دی جائے۔ اس لیے قائداعظم نے بار بار یقین، تنظیم اور ایثار پر زور دیا۔ قائداعظم ہر لحظہ اسلامی ریاست کے قیام کے حامی رہے ہیں۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ پاکستان میں وہی اسلامی معاشرہ قائم ہو جس کا نمونہ حضورِ

اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ طیبہ میں پیش کیا تھا۔ وہ پاکستان کو معاشرتی، سماجی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حوالے سے اسلام کا قلعہ بنانا چاہتے تھے۔ جمہوری اور فلاحی ریاست ان کا خواب تھا جس میں رہنے والے تمام انسان بلاتفریق رنگ ونسل اور مذہب وعقیدہ مساوی حقوق حاصل کر سکیں۔ وہ پاکستان کو تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لانا چاہتے تھے جس میں شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی، اہلِ حدیث، ہندو، عیسائی، پارسی اور قادیانیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو مذہبی آزادی حاصل ہو، کسی پر عرصہ حیات تنگ نہ کرنا اور اُس کو اُس کی عبادات سے منع نہ کرنا، قائداعظم کے ذہن میں پیوست تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں ہر مذہب، ہر رنگ ونسل اور ہر عقیدے کا شخص آسودہ حالی، آزادی اور بے خوف وخطر زندگی گزارے۔ یہی اسلام کے بنیادی اصول ہیں جن پر قائداعظم نے خود بھی عمل کیا اور وہ پاکستان میں بھی ان سنہری اصولوں کا نفاذ چاہتے تھے۔ یہ وہ سنہری اُصول تھے جن کا اطلاق پوری انسانیت پر ہوتا ہے۔

قائداعظم نے اپنے خطبات میں یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر قائم ہوگی اور پاکستان کے نظام، آئین اور ملکی ڈھانچے کو اسلامی اصولوں پر اُستوار کیا جائے گا۔ ان کی زبان سے ہمیشہ یہی نکلتا رہا ہے کہ قرآن ہمارا راہ نما ہے اور ہمیں قرآن کی روشنی میں زندگی بسر کرنا چاہیے۔ ہاں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ قائداعظم مُلائیت کے خلاف تھے۔ مذہبی فرقہ واریت کے حامی نہیں تھے۔ وہ مذہبی تشدد کے مخالف تھے۔ ظاہر ہے جن باتوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے ان باتوں کو پاکستان کا آئین کیسے بنایا جاسکتا تھا۔ مذہبی منافرت، فرقہ واریت، مذہبی تشدد اور مُلائیت اس پاکستان کا حصہ نہیں ہوسکتے جو پاکستان قائداعظم نے بنانا چاہا تھا۔ آج پاکستان ان تمام اصولوں، ضوابط اور بنیادوں سے ہٹ چکا ہے جو قائداعظم کے ذہن میں تھیں۔ جس پاکستان کا تصور قائداعظم نے پیش کیا تھا یہ اُس کے برعکس نظر آ رہا ہے۔ آج فرقہ واریت، تشدد پسندی، لسانی تعصبات، رنگ ونسل کی تفریق، ذات پات کا فرق اور چھوٹے بڑے کا جھگڑا عام ہے۔ یہاں چند خاندانوں کی حکومت قائم ہے جسے ہم بادشاہت یا آمریت تو کہہ سکتے ہیں جمہوریت نہیں اور جس ملک میں جمہوریت نہ ہو، وہ قائداعظم کا پاکستان نہیں ہوسکتا۔

قائداعظم کی مخالفت پر وہ افراد بھی کمر بستہ ہو گئے تھے جو سرمایہ دار اور جاگیردار تھے کیوں کہ قائداعظم کی سیاسی بصیرت عوام کے لیے کام کر رہی تھی اور وہ ایسا پاکستان چاہتے تھے جہاں عوام کی حکومت ہو، عوام کی فلاحی و بہبود کا کام ہو، اور عوام کو مرکزیت اور اہمیت حاصل ہو۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لیے یہ بات تنزل کے مترادف تھی، لہٰذا انھوں نے خود کو پستی میں گرتے دیکھا تو قائداعظم کے مخالف ہو گئے۔ مُلائیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے متوالوں نے قائداعظم کے احکامات کو رد کر کے، ان کے فیصلوں کو صادر نہ ہونے دیا۔ قائداعظم کی تحریریں اور فیصلہ جات کی مسلیں غائب کرنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ قائداعظم کی کچھ تحریریں ترامیم کے بعد منظرِ عام پر لانے لگے۔ جس کا اثر آج پاکستان میں نظر آ رہا ہے کہ مذہبی تشدد پسندی نے زور پکڑ رکھا ہے۔ فرقہ واریت عام ہے، نسلی تضادات اور لسانی تعصبات کا بول بالا ہے، مہنگائی کنٹرول میں نہیں ہے، عبادت گاہوں پر حملہ آئے روز کا معمول بن گئے ہیں۔ انسانی جانوں کی ارزانی کسی آنکھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ شہروں میں جنگل کا قانون رائج ہے، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا قانون نافذ ہے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری قائم ہے۔ باپ کے ساتھ اس کی اولاد، اہلیہ، داماد اور تمام رشتے داروں میں حکومتی عہدوں کی بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ سرمایہ چند خاندانوں کی میراث ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت پر دو تین پارٹیوں کا اجارہ قائم ہو گیا ہے۔ بادشاہت کا نظام چل رہا ہے۔ یہ آمریت غیر رسمی ہے، اسے ہم کسی طور پر جمہوریت نہیں کہہ سکتے۔

اگر قائداعظم کے قوانین، اصول اور افکار کی روشنی میں پاکستان کو چلایا جاتا تو ان کے نظام کو نافذ کیا جاتا، ان کے فیصلوں کو مانا جاتا، ان کے احکامات پر عمل درآمد ہوتا، پاکستان کو مسلم ریاست بنایا جاتا، اسے مُلائیت، مذہبی شدت پسندی اور غیر مساویانہ رویوں سے بچایا جاتا، حکومت کی بھاگ دوڑ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، امیروں، کبیروں، وڈیروں اور چودھریوں کو دینے کی بجائے قائداعظم کے ساتھیوں، ملک و قوم کے وفاداروں، افکارِ قائداعظم کے ماننے والوں اور محبّ الوطن، اسلامی شعار کے جانشینوں کو دی جاتی تو آج پاکستان کی ترقی کا عالم قابلِ مثال ہوتا

اور دنیا میں پاکستان کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا اور پاکستانی قوم کا وقار قائم رہتا۔آج مسلمانوں کو دہشت گرد کہہ کر پکارا جارہا ہے۔ مسلمانوں کو ذلیل وخوار کیا جارہا ہے۔ پاکستان کو تیسرے درجے کی مخلوق سمجھا جارہا ہے۔ یہ سب قائداعظم کے مشن سے انحراف کا سبب ہے۔ قائداعظم کے نظریات کے برعکس ہونے کا سبب ہے۔قائداعظم کے تصورات کو پسِ پشت ڈالنے کا سبب ہے۔قائداعظم نے اپنے خطبے میں افسران اور صاحبِ اقتدار لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ باتیں باور کرائیں کہ آپ حکمران نہیں بلکہ عوام کے خادم ہیں۔آپ کو عوام پر حکومت نہیں کرنی بلکہ ان کی خدمت کرنی ہے۔آپ خود کو حکمران طبقے میں شمار نہ کریں بلکہ خدمت گاروں میں آپ کا شمار ہونا چاہیے۔آپ ان کے آقا بن کر ان سے غلاموں والا سلوک نہ کریں بلکہ ان کے دوست، مددگار اور خیر خواہ بن جائیں اور ان سے ہم دردی، لحاظ و مروّت اور نرم روی سے پیش آئیں۔ان کے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لے کر مساوی رویہ اختیار کریں۔قائداعظم کا مقصد پاکستان میں قانون کی بالادستی کا قیام تھا مگر یہاں اسی قدر لاقانونیت کا بول بولا ہے جس قدر قائداعظم نے اس کی بیخ کنی کرنا چاہی۔

جس طرح اسلام کی نظر میں انسان کو دنیا کی تمام مخلوقات پر افضیلت حاصل ہے اسی طرح قائداعظم کی نظر میں بھی انسان کا رتبہ تمام اشیا اور مخلوقات سے اعلیٰ تھا۔انھوں نے تمام عمر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا اور انسانیت کی فلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔کوئی شخص اپنی طاقت سے زیادہ کام نہیں کرسکتا مگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قائداعظم نے اپنی طاقت سے زیادہ کام کیا۔اپنی عمر سے زیادہ زندگی گزاری۔وہ انسان، مسلمان اور پاکستان سے اس قدر وفادار اور ان پر جاں نثار تھے کہ ایک بار ان کی اس جاں نثاری، قربانی اور ایثار کو دیکھ کر ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے کہا:

"آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور کام کے اوقات کم کردیں۔"

قائداعظم نے جواب دیا:

"کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو

اوراس کے جرنیل نے چھٹی لے لی ہو۔"

فاطمہ جناح نے مزید کہا:

"آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔"

قائداعظم نے جواب دیا:

"جب میں دس کروڑ افراد کی بقا کے لیے تشویش میں مبتلا ہوں تو ایک فرد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے۔"

یہ وہ عظیم ہستی ہیں جن کو آج ہم قائداعظم محمد علی جناح کے نام سے یاد کرتے ہیں جن کے ایثار و جاں نثاری کے سبب ہم آزاد ملک پاکستان میں سکون کا سانس لے رہے ہیں اور آزادی سے جی رہے ہیں۔ ہمیں مل کر سوچنا ہے کہ پاکستان کو قائداعظم کا پاکستان کس طرح بنایا ہے۔ اس میں ہماری عزت، نیک نامی، وقار اور بقا شامل ہے۔ قائداعظم کے تصورِ ریاست کے سانچے میں پاکستان کو ڈھالنے سے ہی استحکامِ پاکستان کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ ہمیں افکارِ قائداعظم ہی پر عمل سے ترقی کی راہیں مل سکتی ہیں اور ہمارا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہے اور ہمارا کھویا ہوا وقار بحال ہو سکتا ہے۔

◆◆◆

MAAB 1431
maablib.org

ڈاکٹر جمال نقوی اپنی تعلیمی قابلیت، ذہنی صلاحیت، علمی استعداد اور تحقیقی و تنقیدی کام کی وجہ سے نہ صرف مختلف اداروں کے کلیدی عہدوں پر فائز رہ کر فرائضِ منصبی ادا کر رہے ہیں بلکہ اُردو ادب کی نثری و شعری تخلیقات میں بھی مصروف ہیں۔ چوالیس نثری و شعری کتب اُن کے سرمایہ فن میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمال نقوی کی مرتب و مدوّن کردہ کتاب "تصوراتِ قائداعظم" قائداعظم کے افکار و خیالات، سوانح اور نظریات پر شایع ہونے والی کتابوں میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی نے ہمیشہ اُردو ادب کی قدآور شخصیات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس کتاب میں بھی اُنھوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے مختلف تصورات پر لکھے گئے اُردو ادب کے (ایک دو کو چھوڑ کر) جید ناقدین و مشاہیر کے وہ مضامین مرتب و مدوّن کیے ہیں جن کی گونج آج تک دنیائے اُردو ادب میں سُنی جاتی رہی ہے۔

میں ڈاکٹر جمال نقوی کو ایک اور قابلِ مطالعہ کتاب کی ترتیب و تدوین پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محمود اختر خان

Rang-e-Adab Publications
Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.
0345-2610434 0336-2085325
021-32761100 0300-2054154
rangeadab@yahoo.com /rangeadab

ISBN: 978-969-7665-70-9
Rs: 600/-